اپنی مٹّی
احمد عثمانی

اپنی مٹی

احمد عثمانی

- ترتیب : مجید انور
- کتابت : جمال ہاشم
- سرورق : احمد حنیف
- ناشر : جواز پبلی کیشنز مالیگاؤں
- قیمت : تیس روپے
- تعداد : ۵۰۰
- سنہ اشاعت : اگست سنہ ۱۹۹۱ء
- طباعت : سردار پریس مالیگاؤں

رابطہ

- جواز پبلی کیشنز ، المامون ، جامعہ روڈ نعمانی چوک مالیگاؤں
- سویرا بک ڈپو ، محمد علی روڈ ، مالیگاؤں
- مکتبہ جامعہ ، پرنس بلڈنگ ، بمبئی ۹

سجّاد عزیز

کے

نام

اِس کتاب کی اشاعت میں مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو اکیڈمی
کا جزوی مالی تعاون شامل ہے۔

۱ بھنور

زندگی میں ایسے موڑ بھی آتے ہیں جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایسے وقت انسان اپنے آپ کو غیر اہم اور معمولی سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حادثے کا شکار تو کوئی اور ہوتا ہے لیکن ہم اپنے آپ کو اس حادثے میں شریک سمجھتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ حادثے کا شکار تو زاہد صاحب تھے لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس میں میں بھی شامل ہوں۔ اور اس حادثے نے مجھے بیس برس پیچھے ماضی میں ڈھکیل دیا۔ زاہد صاحب اور میری دوستی کے کئی ورق الٹ گئے۔

زاہد صاحب محلّے میں ہی رہتے تھے۔ ابتدا میں علیک سلیک ہوتی تھی۔ پھر چلتے چلتے ہم ایک دوسرے کی قربت کے بہانے ادھر ادھر کی بات کر لیا کرتے تھے۔ چند دن بعد ہماری دوستی ہو گئی۔ ہم لوگ ہوٹل میں بیٹھنے لگے۔ گپ شپ ہونے لگی۔ حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ، سماج کی تبدیلیوں اور برائیوں پر چوٹیں ہونے لگیں۔ کبھی وہ غالب کا کوئی چبھتا ہوا شعر سناتے تو میں میر کا کوئی گداز مصرع سناتا۔ کبھی کبھی ہماری بات چیت گرماگرم اور طویل بھی ہو جاتی جسے ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگ دلچسپی سے سنتے۔

زاہد صاحب معقول آدمی تھے۔ کسی محکمے میں نوکری تھی، لیکن رہتے تھے بڑے ٹھسّے سے۔ بات چیت کا انداز بڑا متاثر کن تھا۔ میں ان کی بڑی قدر کرتا تھا۔ ان کی آمد کا

منتظر رہتا تھا۔

دو ایک سال بعد زاہد صاحب میں کچھ تبدیلیاں ہونے لگیں۔ وہ کئی کئی دن غائب رہنے لگے۔ جب ملتے کچھ کھوئے کھوئے پریشان سے دکھائی دیتے۔

میں نے پوچھا بھی تو بس مسکرا کر رہ گئے۔ مسکراہٹ بڑی پھیکی اور مریضانہ سی تھی۔

ایسی کوئی بات تھی جسے وہ مجھے بتانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ پہلے کی طرح گرم گفتاری اور خوش مزاجی بھی نہیں دکھاتے تھے۔ بس خاموش رہتے تھے۔

ایک مرتبہ کئی دن بعد ملے۔ اُس دن ہم نے ایک ہی نشست میں کئی چائے کی پیالیاں ختم کیں اور ڈھیر سارے سگریٹ پھونکے۔ میں ہی بولتا رہا۔ وہ چائے پیتے رہے سگریٹ جلاتے رہے یا میری باتیں سنتے رہے۔ میں نے بہت کریدا تو انہوں نے صرف اتنا کہا:

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

میں مسکرایا اور تشریحاً کہا:

"نہیں جناب! یہ بات نہیں، غالبؔ دانا بھی تھا اور اپنے ہنر میں یکتا بھی تھا، لیکن اس شعر کے ذریعے خاکساری جتا رہا ہے۔ غالبؔ کے قصّے تو آپ جانتے ہی ہیں۔ ڈومنی سے اس کا....."

زاہد صاحب اچانک اٹھ کھڑے ہوئے اور تیز تیز قدموں سے ہوٹل کے باہر نکل گئے۔ پھر بہت دنوں تک انہوں نے ادھر کا رُخ نہیں کیا، ان کی یاد بھی آتی لیکن میں نے انہیں تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی ان کے موجودہ حالات جاننے کی۔

ایک دن میں ہوٹل میں یوں ہی بیٹھا اخبار کے صفحے الٹ پلٹ رہا تھا کہ ایک صاحب جن سے معمولی شناسائی تھی، میرے قریب آکر بیٹھ گئے اور بولے:

"آج اکیلے نظر آ رہے ہیں، آپ کے زاہد میاں دکھائی نہیں دیتے؟"

میں نے اخبار پر سے نظریں ہٹا کر انہیں دیکھا تو جواب کا منتظر پایا۔ میں نے کہا:
"پتہ نہیں آج کل کس الجھن میں ہیں۔ پندرہ دن سے اوپر ہو گئے وہ ملے تھے،
تب سے پتہ نہیں کہاں ہیں؟"

میرا جواب سن کر وہ اور نزدیک کھسک آئے اور گویا ہوئے:

"آپ نہیں جانتے آج کل وہ کیا کر رہے ہیں؟"

"بالکل نہیں!" میں نے جواب دیا۔

وہ حضرت میری طرف یوں جھکے جیسے بڑی رازدارانہ بات بتانے والے ہوں۔ پھر دھیمی آواز میں کہنے لگے:

"جناب! وہ آج کل ایک عورت کے چکر میں ہیں۔ سنا ہے کسی اسپتال کی نرس ہے۔ پہلی بیوی کو چھوڑ دیا ہے یا چھوڑنے والے ہیں۔ نکاحِ ثانی بھی ہو چکا۔ آج کل گھر سے نہیں شہر سے بھی غائب ہیں۔"

"لیکن نوکری؟" میں نے سوال کیا۔

"دونوں سرکاری نوکر ہیں چھٹی لی ہو گی۔" انہوں نے بڑے وثوق سے کہا۔

ان صاحب کی بات سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ چکر سا محسوس ہوا۔ یہ بکھیڑا پھیلایا زاہد صاحب نے! بڑے اصلاحی بنتے تھے۔ پھر ذہن میں کبھی کتابوں میں پڑھی بات یاد آئی کہ محبت عمر نہیں دیکھتی۔ لیکن یہ بات کتابوں میں ہی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ عملی زندگی میں یہ مقولہ بڑی الجھن پیدا کرتا ہے۔

پتہ نہیں زاہد صاحب کس حال میں ہوں۔۔! ان کے لیے میرا دل بھر آیا، اور میں بے چین ہو گیا۔

میں نے پتہ لگایا۔ تمام باتیں حرف بہ حرف سچ تھیں۔ میں اس زاہد شکن کو دیکھنا چاہتا تھا جس نے زاہد صاحب جیسے جہاندیدہ شخص کو اپنی زلف کا اسیر بنا لیا۔ کئی دن تک میں بے چین سا رہا۔ ایک دن اچانک زاہد صاحب ایک برقعہ پوش خاتون کے ساتھ نظر آئے۔ میں نے مخاطب ہونا

مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن مجھے دیکھ کر وہ خود ہی رُک گئے۔ سلام علیکم کہا، مسکرائے پھر کہا :

"اِن سے ملو! یہ ہیں تمہاری نئی بھابی۔"

مَیں نے آداب کہا تو خاتون نے برقعہ اُٹھایا اور آداب کہا۔ مَیں نے زاہد تسکین کو دیکھ لیا اور اندازہ لگایا کہ واقعی وہ اسمِ بامسمّیٰ ہیں۔ کچھ مطمئن کچھ غیر مطمئن سا گھر آیا۔

زاہد صاحب جو یار باش قسم کے آدمی تھے، اب بیگم بردوش سے ہو گئے تھے کبھی کبھار راستہ چلتے نظر آتے تھے۔ اب ان کے کپڑے بڑے سلیقے کے ہوتے تھے اور پرانی سائیکل کی جگہ اسکوٹر نے لے لی تھی۔ اُن کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ کپڑوں کی تراش خراش تو تبدیل ہو گئی تھی، لیکن چہرے پر بے اطمینانی کی لکیریں بکھر گئی تھیں۔

بظاہر دیکھنے والوں کو ان کے حالات کی آسودہ سی تبدیلی پر رشک آتا تھا لیکن مجھے اوروں کی نظر سے نہیں، اپنی نظروں سے دِکھائی دیتا تھا کہ خاموش سمندر میں کہیں نہ کہیں بھنور ہے جو زاہد صاحب کے بے شکن بے داغ کپڑوں، چمک دار جوتوں، چم چماتی گھڑی اور ان کے نئے نویلے اسکوٹر کی آواز میں چھپا ہوا ہے۔

بہت دنوں تک زاہد صاحب سے ملاقات نہ ہوئی۔ ایک دن انہوں نے اسکوٹر پر سے ہاتھ دیا تو میں نے دیکھا، سامنے ایک بچہ اور پیچھے وہی خاتون نظر آئیں جنہوں نے مجھے آداب کیا تھا۔ ان کے چہرے پر ایسا سکون تھا جیسا طوفان آنے سے پہلے سمندر میں ہوتا ہے اور کچھ فربہی بھی چڑھ رہی تھی۔

مَیں نے سوچا : چلو زاہد صاحب کا معاملہ تو نپٹ گیا۔ اچھا ہوا۔ بے چارے کچھ آسودہ تو ہو گئے۔ خوش حالی آج کے دَور میں خوش نصیبوں کو ہی میسّر آتی ہے .....

لیکن چند دنوں بعد ہی زاہد صاحب کے متعلق عجیب عجیب خبریں آنے لگیں۔

زاہد صاحب کی پہلی بیوی نے اُن پر نالش کر دی ہے۔ عدالت نے ان کے خلاف فیصلہ دے دیا ہے اور زاہد صاحب کو ایک موٹی رقم ادا کرنی ہے، اور ہر ماہ ایک الگ رقم بھی۔ زاہد صاحب پریشان ہیں۔ بچوں کی تعداد بھی بڑھ گئی ہے۔ گھر خرچ بھی بڑھتا چلا گیا۔ اُن کی

نئی بیوی نے معیارِ زندگی بلند کرنے کے چکر میں خود ہی خرچ بڑھا لیا۔ مہنگائی ہے کہ آسمان کو چھو رہی ہے۔ انسان کا مارا کس بل نکل گیا ہے۔ بے چارے زاہد صاحب دُبلے بھی ہو گئے ہیں۔ غرض جتنے مُنہ اتنی باتیں۔

وقت کا چکر چلتا رہا۔

مَیں اب کبھی کبھار باہر نکلتا۔ ہوٹل میں تھوڑی دیر بیٹھتا۔ پُرانی یادوں کو تازہ کرتا اور گھر چلا آتا۔ ایک دِن میں اخبار میں منہمک تھا کہ زاہد صاحب آگئے۔ مَیں نے کھڑے ہو کر انہیں خوش آمدید کہا اور دیکھنے لگا کہ اُن کا اسکوٹر کہاں کھڑا ہے، لیکن اسکوٹر دِکھائی نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئے۔ مَیں نے کہا:

"آج ہم بہت پیچھے ماضی میں چلے گئے ہیں، جب شب باشی اور گپ بازی ہوتی تھی۔ مجھے بیس سال پہلے کا زمانہ یاد آرہا ہے۔"

مَیں نے چائے کا آرڈر دیا۔ انہوں نے بیرے کو روک کر کہا:

"ایک بغیر شکر کی لانا۔ یہ سالا شوگر کا بھی عجیب روگ ہے ــــ نکالے نہیں نکلتا۔"

بیرا انہیں حیرت سے دیکھتا بڑبڑاتا چلا گیا، جیسے کہہ رہا ہو "جو لوگ زیادہ آسودہ حال ہوتے ہیں اُن پر خدا کی کچھ نعمتیں اکثر بند ہو جاتی ہیں۔" وہ ہمیشہ یہ ریمارک دیا کرتا تھا۔

میں نے پوچھا:

"کہیے کیا حال ہے آپ کا؟ بہت دنوں بعد پُرانی جگہ کی یاد آئی۔ پرانے دوستوں کو یاد رکھنے کا شکریہ!"

زاہد صاحب میری طرف دیکھتے ہوئے بولے:

"کیا بتائیں صاحب! بس گزر رہی ہے۔ لیکن مَیں نے جو سوچا تھا وہ نہ ہو سکا۔ میرے اندر طوفان برپا رہتا ہے۔ مَیں اپنے گلّے سے الگ ہونے والا ایک جانور بن گیا ہوں۔"

مَیں نے کہا:

"زاہد صاحب! سمندر میں آئے طوفان سے ملّاح کسی نہ کسی طرح کشتی کو ساحل تک لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن کشتی میں ہی برپا ہونے والے طوفان سے ملّاح نپٹ نہیں سکتا۔"

زاہد صاحب نے فوراً کہا:

"ہاں صاحب وہی تو بات ہو گئی ہے۔ میرے یہاں بھی طوفان برپا ہے۔" پھر دھیرے سے بولے "نہ بیگم عزّت کرتی ہیں نہ بچے۔ آدمی کو گھر میں اور باہر عزّت چاہیے جو مَیں گھر اور باہر دونوں جگہ گنوا بیٹھا ہوں۔"

پھر وہ ہوٹل ہی میں پھوٹ پھوٹ کر یوں رونے لگے جیسے بیس سال سے جو لاوا ان کے اندر پک رہا تھا اُسے آج ہی نکال پھینکنا چاہتے ہوں۔

••

۲ کوکھ جلی

ہری سنگھ جب کبھی ساوتری کی طرف دیکھتا تو محسوس کرتا کہ ساوتری کے چہرے پر گہرے سمندر سی خاموش اُداسی ہے۔ ہری سنگھ ساوتری کا درد جانتا تھا۔ اِس لیے وہ بھی اس کی طرف دیکھ کر اُداسی کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتا۔

ہری سنگھ اور ساوتری کی شادی ہوئے سات سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ ان سات سالوں میں ساوتری نے اپنی کوکھ کی کھیتی کو ہری کرنے کے کئی جتن کیے۔ لیکن اس کی کوکھ ایسی بنجر زمین تھی کہ جس میں کونپل پھوٹنے کا نام نہیں لیتی تھی۔

اُس نے مندروں کے در و دیوار ہلا دیے، بھگوان کے چرنوں کو اپنے آنسوؤں سے دھو ڈالا، مزاروں پر چادریں چڑھائیں، نیاز نذرانے دیے، مزاروں کی خاک چاٹی، بوسے دیے، سجدے کیے۔ اس تمام عمل سے گزرتے ہوئے مجاوروں کی لال پیلی بھوکی آنکھوں کی تیز نظروں سے اپنے بدن کو چھید چھید لیا۔ مندروں کے مسٹنڈے پروہتوں کی لالسا بھری آنکھوں کی تاب نہ لا کر اپنی نظریں جھکا لیں اور اپنے بدن کو ڈھانک ڈھانک لیا۔

کچھ لوگوں نے تانترک عمل کرنے کی بھی صلاح دی، لیکن ہری سنگھ اور ساوتری ان تانترکوں کو اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ تانترک کے عمل کا نام لے کر اپنی ہوس پوری کرتے تھے، ساوتری اور ہری سنگھ دونوں اس کے خلاف تھے۔ دونوں نے ممتا کی آگ میں جلنا منظور کیا لیکن تانترک کو نہیں مانا۔

ساوتری کہتی :

"مجھے بچہ ضرور چاہیے لیکن بھگوان دے تب۔ کسی انسان کے دیئے بچے کو لے کر کیا کروں گی؟"

ہری سنگھ نے اس سے کئی بار کہا بھی ـــ "ایسا کرتے ہیں کسی اناتھ آشرم سے بچہ لے آتے ہیں۔"

ساوتری نے دونوں ہاتھ کان تک لے جا کر کہا :

"نا بابا! پتہ نہیں وہ بچہ جائز ہوگا کہ ناجائز ہوگا۔ مجھے نہیں چاہیے اناتھ آشرم کا بچہ۔ سنا ہے کہ آج کل اناتھ آشرم میں زیادہ بچے ایسے ہوتے ہیں جن کو کنواری مائیں جنم دے کر اپنے پاپ کو چھپانے کے لیے اناتھ آشرم کی گود میں ڈال دیتی ہیں۔"

اس کی باتیں سن کر ہری سنگھ خاموش ہو جاتا۔

ہری سنگھ کے رشتہ داروں نے اسے یہ بھی صلاح دی کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ ساوتری نے بھی مشورہ دیا۔ لیکن مشورہ دینے کے بعد اس کی آنکھوں میں جو کرب اترا اسے دیکھ کر ہری سنگھ نے ہر بار انکار کر دیا۔

گاؤں میں جب بھی ساوتری کا ذکر ہوتا تو عورتیں اس کے نام کے ساتھ کوکھ جلی کا اضافہ ضرور کرتیں۔ آج بھی ہمارے گاؤں قصبوں میں اولاد نہ ہونا بدشگونی مانی جاتی ہے۔ ایسی عورتوں کی صورت سہاگنیں دیکھنا پسند نہیں کرتیں۔ شادی بیاہ میں ان کو بلایا نہیں جاتا۔

ایسی عورت بڑے کڑے امتحانوں سے گزرتی ہے۔ گھر میں، رشتہ داروں میں، گاؤں میں وہ اکیلی کرب جھیلتی ہے۔ ٹوٹے پتے کی طرح ہوا میں ڈولتی ہے۔ اس کا انسانوں کے ریوڑ میں کوئی غم خوار نہیں ہوتا۔

ساوتری ان سب کڑے کوسوں سے گزر رہی تھی صرف ہری سنگھ کی وجہ سے۔ ہری سنگھ اس کو دلاسہ دیتا۔ دیوی دیوتاؤں کے قصے سناتا جو بے اولاد تھے اور کہتا کہ آج کل اپنا دیس انسانوں کی زیادتی کی وجہ سے پریشان ہے تو پھر تو کیوں آبادی میں اضافے

کے لیے بے چین ہے۔ وہ ٹوالے دیتا: "چینی بابو کے صرف تین ہی نہ بچے ہیں لیکن وہ کتنے پریشان ہیں، تو کیوں سنتان مانگ کر اپنی زندگی دکھ میں ڈالتی ہے؟"

لیکن ہری سنگھ کو کیا معلوم کہ سنتان کے دکھ میں کتنا سکھ ہے۔ کھیتی اسی وقت کھیتی کہلاتی ہے جب اس کی کوکھ سے کونپل پھوٹتی ہے اور دھرتی پر ہری ہری دوب سی لہراتی ہے۔ ایسی کھیتی دل کو سکون اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ بنجر کھیتی کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔

ساوتری اکثر خواب دیکھتی ــ کہ ایک پری آسمان سے اُتری ہے اور ایک چاند کا ٹکڑا اس کی گود میں ڈال کر پھر آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں کھو گئی ہے ــ کبھی وہ اپنے کھیت کی میڈھ پر بیٹھ کر سوچتی کہ دیوی پاربتی اس کی طرف آ رہی ہے۔ اُس کے ہاتھوں میں ایک ہُمکتا بچہ ہے۔ وہ اس بچے کو ساوتری کی گود میں دے کر غائب ہو جاتی ہے۔

ایک دن وہ یوں ہی خواب دیکھتے دیکھتے سرکنڈوں کے ڈھیر ایک جگہ جا کر رکھ رہی تھی، ہری سنگھ سرکنڈے جمع کر کے گٹھے باندھ رہا تھا۔ ساوتری اٹھا اٹھا کر لا رہی تھی کہ عجیب سا شور بلند ہُوا۔

ہری سنگھ اور ساوتری نے چونک کر دیکھا۔ سب لوگ گاؤں کی طرف بھاگ رہے ہیں، جیسے اُن کے پیچھے کوئی درندہ دوڑ رہا ہو۔ وہ دونوں بھی گاؤں کی طرف بھاگنے لگے۔ گاؤں پہنچ کر سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے۔

شام ہوتے ہوتے گاؤں میں کئی پولیس کی گاڑیاں آئیں اور کرفیو کا اعلان ہو گیا۔ سارا گاؤں سنسان ہو گیا۔ کبھی کبھار کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتیں یا کوئی بھیانک چیخ سنائی دیتی۔ پھر پولیس کی گاڑیاں دوڑتیں۔

ہری سنگھ اور ساوتری بھی اپنے ویران گھر میں دبکے پڑے تھے۔ ایسے وقت گھر اور ویران لگتا ہے جب کہ مرد اور عورت گھر میں زیادہ وقت گزارتے ہیں۔ اندر کا کرب تو تھا ہی اب باہر کا کرب بھی ویرانی بن کر اُن کے چہروں پر اُبھر آیا تھا۔

دو دن اور دو راتیں گزرنے کے بعد گاؤں میں انسانی آوازیں آنے لگیں، تو ہری سنگھ نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔ باہر لوگ تیز تیز آجا رہے تھے۔ ہری سنگھ نے صافہ باندھا اور لاٹھی ہاتھ میں لی۔ تب ہی ساوتری بھی اس کے ساتھ چلنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہری سنگھ نے کہا:

"تو نہ آ۔ میں صرف ایک نظر کھیت پہ ڈال آتا ہوں۔"

ساوتری کہاں مانی۔ اس نے کہا:

"تم اکیلے نہ جاؤ۔ میں بھی ساتھ ہی چلوں گی۔ ہمارا دکھ ایک ہے تو پھر تم اکیلے کیوں جاؤ؟"

تھوڑی دیر بحث کرنے کے بعد دونوں کھیت کی طرف چلنے لگے۔

ان کا کھیت گاؤں سے دور تھا۔ وہ تیز تیز چلتے ہوئے کھیت میں پہنچے۔ دوسرے کھیتوں میں کہیں کہیں کوئی دکھائی دیتا تھا۔ جب وہ میڈھ پر ہی تھے تب ہی انہیں رونے کی آواز آئی، جیسے کوئی بچہ بھوک سے بلک کر رو رہا ہو۔

انہوں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو محسوس ہوا کہ سر کنڈوں کے ڈھیر سے آواز آرہی ہے۔ ہری سنگھ دوڑ کر سر کنڈوں کے ڈھیر کے قریب پہنچا۔ ساوتری بھی اس کے ساتھ ہی پہنچی۔ دونوں جلدی جلدی سر کنڈے ہٹانے لگے۔

دو تین ہی گٹھے ہٹانے کے بعد انہیں ایک گول گوتھنا سا بچہ دکھائی دیا، جو ہتھیاں ہلا ہلا کر رو رہا تھا — تین چار مہینے کا صحت مند بچہ۔

ہری سنگھ نے جھٹ صافہ کھولا اور بچے کو اس میں لپیٹ لیا۔ ساوتری کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا خواب پورا ہو گیا ہو۔ اس کے کھیت میں بھگوان نے اس کو بچہ دے کر اس کی کوکھ ہری کر دی ہو۔ اس کی سوئی ہوئی ممتا پوری طرح عود کر آئی۔ اس کی چھاتی میں دودھ تو نہ تھا۔ بچے کا سوکھا چہرہ دیکھ کر وہ دوڑتی ہوئی گئی اور نہر سے اپنا دامن بھگو لائی اور بچے کے منہ میں پانی ٹپکانے لگی۔ بچہ پانی چوسنے لگا اور چپ ہو گیا۔ پھر اس نے

جھپٹ کر بچّے کو ہری سنگھ کے ہاتھوں سے لے لیا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس نے ہری سنگھ کی طرف دیکھا تو ہری سنگھ کو یوں لگا جیسے کچھ دیر پہلے ساوتری کے چہرے پر پھیلے کرب نے اطمینان کی جگہ لے لی ہے اور اس کی آنکھوں میں ویسی ہی روشنی پھیلی ہے جیسے ایک بچّے کو جنم دینے کے بعد ماں کی آنکھوں میں پھیلتی ہے ـــــ چاند کی کرنوں کی طرح پھیلتی روشنی۔

ساوتری نے زور سے کہا: "ویر سنگھ!" پھر وہ بچّے کو پیار کرنے لگی۔

●●

۳ کفّارہ

امتیاز خاں اپنے چھوٹے سے گاؤں سے چل کر بڑے شہر میں اس لیے آیا تھا کہ وہ شہر میں اپنی زندگی بنائے گا، چھوٹے بھائی بہنوں کو خوب پڑھائے گا۔ اس کا چھوٹا سا کھیت اتنے بڑے کنبے کی پرورش کرنے میں ناکام ہُوا تو اس نے اور لوگوں کی طرح شہر کا رُخ کیا۔ اُسے بار بار ماں کی آنکھوں کے آنسو، باپ کی وحشت بھری چُپ، چھوٹے بھائی بہنوں کی مسکراہٹیں یاد آتی تھیں۔ اُس نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد ہی اُن کے لیے ڈھیر سارے کپڑے، کھلونے، مٹھائیاں اور اچھی اچھی کتابیں بھیجے گا۔

لیکن یہاں تو اس کا ہی پیٹ خالی تھا۔ اُس کا جسم تھک کر چُور ہو رہا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے گرنے ہی والا تھا کہ چند آدمی اُس کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ اور ایک نے کہا:

"بھائی صاحب! ہم اس شہر میں اجنبی ہیں۔ راستہ معلوم نہیں ہے۔ آپ ہمیں بازار کا راستہ بتا دیجیے یا وہاں تک چھوڑ دیجیے۔ ہم آپ کا محنتانہ ادا کر دیں گے۔"

"لیکن آپ کون سے بازار جانا چاہتے ہیں؟ یہاں کئی بازار ہیں۔" امتیاز خاں نے کام کی تلاش میں سارا شہر جان لیا تھا۔

"اب آپ سے کیا چھپانا" ایک نے بائیں آنکھ دبا کر کہا "بازارِ حُسن! سمجھے جناب!"

وہ اپنی تمام قوت یکجا کر کے انہیں لے کر چلنے لگا۔ ایک آدمی نے سگریٹ پیش

کی تو اُس نے نہیں لی۔ دوسرے نے بھُنے ہوئے چنے دیے تو اس نے لے لیے۔

چلتے چلتے ایک آدمی نے پوچھا:

"آپ کتنے دِنوں سے یہ دھندہ کر رہے ہیں؟"

اسے غصّہ تو بہت آیا۔ لیکن اس کی بھوک غصّے پر غالب آگئی۔ اس نے جواب دیا:

"صاحب دھندہ وندہ تو مَیں نہیں کرتا۔ آپ جیسے شریف لوگ مل جاتے ہیں تو رہنمائی کر دیتا ہوں۔"

اپنی شرافت کا سُن کر وہ لوگ خوش ہو گئے، اور اس سے کہا:

"آپ اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ آج آپ ہمارے مہمان رہیں گے۔ ہمارے ساتھ کھانا کھائیے۔ ہم آپ کو خوش کر دیں گے۔"

تھوڑی دُور چلنے کے بعد وہ لوگ منزل پر پہنچ گئے۔ وہ انہیں لیے ہوئے ایک بلڈنگ میں داخل ہُوا۔ یہاں عجیب سی سڑاند پھیلی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ کچرے کے ڈھیر تھے، دیواروں پر پان کی پیکیں تھوک تھوک کر بے ہنگم نقش بنا دیے گئے تھے۔ لیکن یہاں بڑی چہل پہل تھی۔ میلہ سا لگا ہُوا تھا۔ لوگ آجا رہے تھے۔

مکان کیا تھا اچھا خاصا قید خانہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت ساری عورتوں کو اچھے اچھے کپڑے پہنا کر قید کر لیا گیا ہو۔ ہر کمرے کے دروازے پر لوہے کا جالی دار پھاٹک تھا۔ عورتیں روشنی کی چکا چوند میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ پھاٹک پر ایک ہٹا کٹا آدمی کھڑا تھا۔ اس کا کام پھاٹک کھولنا اور بند کرنا تھا۔ وہ ایک دروازے پر رُک گئے، اور اسے کھولنے کے لیے کہا۔

ایک موٹی کالی بھدی سی عورت تھل تھل چلتی ہوئی آئی اور دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی اور بولی:

"کوئی لفڑا انٹ شنٹ نہیں منگتا۔ جلدی نکلنا منگتا۔ پہلے پیسہ دیتا۔"

پھر اُس نے بازو کھڑے ہوئے آدمی کو اشارہ کیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور وہ

اندر داخل ہوئے۔ اُس کے ساتھ آئے ہوئے لوگ تو اندر چلے گئے، وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

اس کے لیے یہ زندگی کا ایک نیا تجربہ تھا، نئی بدبو تھی، نئے لوگ تھے۔ لیکن اسے اطمینان تھا کہ اس بدبو میں، ان نئے لوگوں میں اس کی بھوک مٹ جائے گی۔ ایک وقت کا کھانا اُس میں دیر تک بھوکے رہنے کی قوت تو پیدا کر دے گا۔ وہ انہیں خیالات میں غرق بیٹھا تھا کہ وہی بھدی عورت آئی اور بولی:

"اے چھوکرا! تم نہیں جائے گا؟"

"نہیں۔"

"تو پھر اِدر کائے کو آیا؟"

"یہ نیا لوگ باہر سے آیا تو ان کو لے کر آیا۔"

"اچھا اچھا تم اِدر لایا۔ اچھا کیا۔" عورت نے اسے سر سے پیر تک دیکھا مضبوط بدن کا نوجوان نظر آیا۔ اس نے کہا "اِدر کام کرے گا؟ ــــ جو بی کام ام بولے گا۔ تم کو ام پگار (تنخواہ) دے گا۔ رات دن اِدر ئیچ رہنا مانگتا۔"

اُس نے سوچا ٹھیک ہی بولتی ہے۔ ایک ٹھکانا ہو جائے گا۔ کچھ دنوں بعد پیر جم جائیں گے تو کوئی نیا کام تلاش کر لیں گے۔ اُس نے جواب دیا:

"ٹھیک ہے کام کروں گا۔"

"بولو کیا پگار لے گا؟"

"جو تم دے دو۔"

"کھانا کھلا کر سو روپیہ دے گا بولو منجور۔"

اس نے اسی عورت کے لہجے میں جواب دیا "منجور"

"کیا نام ہے تمہارا؟" عورت نے پوچھا۔

"اِمو۔"

وہ امتیاز خاں سے اِمو بن گیا تھا۔ امتیاز خاں یہ کام نہیں کر سکتا تھا اس لیے

اُس نے اپنا نام بھی بدل لیا تھا۔ اب وہ ایک نیا آدمی تھا۔

"امّو" عورت نے نام دہرایا اور سوچا: اچھا نام ہے!

اندر کھنکتی چوڑیوں اور ہنسی کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں لیکن وہ اُن سے بے نیاز کھویا ہُوا بیٹھا تھا۔

وہ عورت مسلسل اُس کا جائزہ لے رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ چھوکرا ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ بولتا نہیں کم سُنتا نہیں۔ تھکا ہُوا معلوم ہوتا ہے اور بھوکا بھی۔ اُس نے باہر والے کو آواز دی۔ سات ٹھنڈا، ایک سینڈوچ اور ایک چائے منگوائی۔

باہر والا فوراً ہی تمام چیزیں جالی دار دروازے کے پاس چھوڑ گیا۔ ایک ٹھنڈے کی بوتل عورت نے لے لی اور بقیہ اندر بھجوا دیے۔ چائے اور سینڈوچ اِمّو کو دے دیے۔

سینڈوچ اور چائے دیکھ کر اس کی بھوک شدید ہو گئی۔ لیکن سینڈوچ اٹھاتے اٹھاتے اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے قطرے ٹپک پڑے۔

موٹی بھدّی عورت اُس کے پاس آ بیٹھی "کھالے۔ اور منگتا؟" اس کی ممتا اُبھر آئی تھی۔ اُس کی آواز بھی رُندھ گئی تھی۔ وہ اِس نوجوان کو اپنے بیٹے کے روپ میں دیکھ رہی تھی جو اس بھری دنیا میں کہیں کھو گیا تھا یا اُسے چھوڑ گیا تھا۔

امتیاز خاں جو اَب اِمّو تھا، جلد ہی اُس نے اِس گھر کی نائیکہ لکشمی کا اعتماد حاصل کر لیا۔ اُسے فائیو اسٹار، تھری اسٹار یا جہاں کہیں بھی ہو، مال پہنچانے اور واپس لانے کا کام سونپا گیا۔ وہ اپنا کام برابر کرتا۔ اُسے کافی بخشش بھی مل جاتی تھی۔

اب وہ دُھلے اُجلے کپڑے پہنتا، اچھا کھاتا۔ لیکن کبھی کبھی اس کے اندر کا امتیاز خاں جاگتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ زہر کھا رہا ہو، اور اُس کے بدن پر اُجلے اُجلے کپڑے نہیں بلکہ زہریلے سانپ لپٹے ہوئے ہوں۔ لیکن پھر اِمّو اندر کے امتیاز خاں کو تھپک کر سُلا دیتا، کیوں کہ مجبوری تھی۔ وہ بے چین سا تھا۔ جب کبھی اُسے موقع ملتا تو وہ اِدھر اُدھر جا کر کام تلاش کرتا، لیکن وہی ضمانت، پہچان اس کا راستہ روک دیتی۔ اِس شہر میں صرف وہی

اپنے آپ کو پہچانتا تھا۔

پہلے مہینے کی تنخواہ ایک سو روپیہ جب اُس کے ہاتھ میں آئے تو ہاتھ کانپ گئے۔

وہ سوچنے لگا: یہ سو روپیہ گھر بھیجے یا نہیں؟ وہ زہر جو خود کھا رہا ہے اُسے دوسروں کو بھی کھلانے کا اُسے کیا حق ہے؟ لیکن جس طرح اس کی بھوک نے اسے ذلیل ترین کام کرنے پر مجبور کر دیا تھا، اسی طرح ماں باپ، اور بھائی بہنوں کے سوالیہ چہروں نے دوسرے دن سو روپیہ گھر بھیجنے پر مجبور کر دیا۔

"وہ تو محنت کی مزدوری لیتا ہے۔ اُسے کیا سروکار کہ مزدوری دینے والا کیا کرتا ہے۔" اُس نے سوچا۔ لیکن رہ رہ کر اس کے ذہن میں سوئیاں سی چبھتی تھیں، مگر زندگی رُکنے والی تھوڑی تھی، وہ تو دوڑ رہی تھی۔

اُسے اس جگہ چھ ماہ گزر چکے تھے۔ اُس نے اپنی تنخواہ برابر گھر بھیجی تھی اور بخشش کا پیسہ اپنے پاس رکھا تھا۔ کافی روپیہ جمع ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا: دو تین ہزار روپیہ ہو جائے تو وہ یہ ذلیل کام چھوڑ دے گا اور کوئی دھندہ بیوپار کرے گا۔ یہاں روپیہ تھا، روشنی تھی، آرام تھا، لیکن خوشی نہ تھی جو ایک کسان کو ہل چلا کر ہوتی ہے۔ یہ خوشی مصنوعی تھی۔ وہ روز رات کو ماضی اور حال کے بارے میں غور کرتا۔ دیر تک منصوبے بناتا اور توڑتا۔

ایک رات وہ دیر تک اپنے روز کے عمل میں مگن تھا کہ پاس والے کیبن سے آوازیں آنے لگیں۔ یہ کیبن لکشمی کا تھا۔ اُس نے وقت کا اندازہ کیا: تین یا چار بجے ہوں گے۔ کسی مرد کی آواز تھی وہ کہہ رہا تھا:

"لکشمی! دیکھ لے یہ سودا تیرے فائدے کا ہے۔ جان جوکھم میں ڈال کر تیرے لیے لایا ہوں۔ چھوٹی شادی رچانا پڑی، پنڈت کو دینے پڑے، اور ایک ہزار اس کے چچا کو دیے۔ بہت خرچ ہو گیا، لا نکال پانچ ہزار۔"

"پانچ ہزار! تیری ماں نے کما کر رکھے اتنے؟ تین ہزار لے لے۔ یہ کوئی لنڈرا سی منگتا۔ تجھ کو تو نے لایا تھا وہ تیری ماں نکلی تھی۔ کتنا لنڈرا کھڑا ہو گیا تھا۔

مرد نے کہا:

"ارے یہ تو جنگل کی ہرنی، پہاڑوں کی ملکہ ہے، اس کے لیے یہاں کون آئے گا؟ اور پھر میں نے بیاہ لیا ہے۔ اس کے چچا کو ساہوکار کا قرض چکانے ہزار بھی دیے ہیں۔ تھوڑے دنوں میں خود ہی سیدھی ہو جائے گی۔ اور تو تو اچھے اچھوں کو ٹھیک کر کے رکھ دیتی ہے۔ یہ کس کھیت کی مولی ہے۔ لا نکال رقم۔ تین ہزار ہی دے دے۔"

اِمو نے اپنے کیبن سے جھانک کر دیکھا، ایک بوڑھا ایک خوب صورت لڑکی کو اندر لا رہا تھا۔ اُس نے لڑکی سے کہا:

"یہ میری بہن ہے۔"

لڑکی نے لکشمی کے پیر چھوئے۔ لکشمی نے اُسے گلے لگا لیا۔ اتنی دیر میں وہ آدمی باہر چلا گیا۔ لکشمی نے اسے اپنے کیبن میں بٹھا دیا اور اِمو کو آواز دی۔

وہ لکشمی کے کیبن میں گیا تو لڑکی کو دیکھ کر اس کے بدن میں جھرجھری سی آ گئی۔ لڑکی کیا تھی معصوم حُسن تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ دوبارہ بیچی جا چکی ہے۔ لکشمی نے اِمو سے کہا:

"دیکھ کسی کمرے میں کچھ کھانے کو ہو تو لا، پھر باہر دیکھ کوئی ہوٹل کھلی ہو تو اس چھوکری کے لیے کھانا منگوا۔"

پھر اُس نے لڑکی سے پوچھا:

"کیا نام ہے تیرا؟"

لڑکی نے نظریں جھکائے ہوئے کہا: "سیتا۔"

"ارے بابا یہ تو بہت پرانا نام ہے۔ تیرا نام تو موہنی ہونا چاہیے۔ آج سے تُو موہنی۔" موہنی کو منہ ہاتھ دھونے کا کہہ کر وہ باہر آ گئی۔

اِمو باہر جا چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ہر قیمت پر اس معصوم کو اس دوزخ سے نکال لے گا۔ اس ذلیل جگہ اتنے دِن رہنے کا کفارہ وہ اس طرح ادا کرنا چاہتا تھا۔ بلڈنگ سے

اُتر کر اس نے ایک اونگھتے ہوئے ملباری سے سبزی، پاؤ اور بوائل انڈا لیا اور اوپر چلا گیا۔ لکشمی نے اس سے کہا:

"نیا چھوکری کو کھلا دے۔"

اِمو نے کھانا سیتا عرف موہنی کے سامنے رکھا۔ وہ نیم غنودگی میں بیٹھی کوئی حسین خواب میں الجھی ہوئی سی تھی۔ اِمو نے اُسے چھوا تو وہ ہڑبڑا کر جاگ پڑی۔

"لو کھانا کھالو۔ بھوکی ہوگی۔"

سیتا نے اس کے ہاتھ سے کھانا لے کر کھانا شروع کیا۔ چند نوالے کھانے کے بعد اُس نے اِمو سے پوچھا:

"وہ کہاں ہیں؟"

"وہ — جن کے ساتھ میں آئی ہوں۔"

اِمو نے سوچا — سب کچھ بتا دے۔ لیکن یہ موقع نہ تھا۔ اگر وہ بتا دیتا تو اس کی اپنی زندگی اور نوکری کو خطرہ ہو سکتا تھا۔ اِس لیے وہ خاموش رہا۔ پھر وہ باہر چلا گیا اور لکشمی کو موہنی کے کیبن میں بھیج دیا۔

دوسرے دن نیند بھر سو کر سیتا اُٹھی۔ لکشمی نے اُسے اچھی سی ساڑھی اور بلاؤز دیا۔ نہا دھو کر اس نے کپڑے پہنے تو یوں لگا، کالے کالے بادلوں میں مسکراتا چاند نکل آیا ہے۔ لکشمی اُس کا حسن دیکھ کر تصور ہی تصور میں اپنے آپ کو نوٹوں کے ڈھیر کے سامنے بیٹھی دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ یہ لڑکی اُس کے وارے نیارے کر دے گی۔

اِمو نے دیکھا تو اُس نے اپنے رات کے عزم کو پھر سے دُہرایا۔ اُس نے اپنے ٹرنک سے تمام رقم نکال کر جیب میں رکھ لی کہ موقع ملتے ہی سیتا کو بھگا لے جائے گا، اور اس کے گاؤں چھوڑ آئے گا۔

دوپہر تک سیتا عرف موہنی کے کئی فوٹو لیے گئے اور تھری اسٹار و فائیو اسٹار ہوٹلوں میں پہنچا دیے گئے۔ لیکن لکشمی نے فوٹو لے جانے والوں کو سخت تاکید کی کہ گاہک یہاں لاؤ، مال

باہر نہیں جائے گا۔

اُسی دن رات میں گیارہ بجے ایک آدمی آیا اور اُس نے لکشمی سے کچھ کہا۔ لکشمی نے دھیرے سے انکار کر دیا۔ اُن کی یہ باتیں اشاروں میں ہو رہی تھیں۔ آدمی نے دو انگلیاں بتائیں۔ لکشمی پھر بھی خاموش رہی، تو اس نے تین انگلیاں بتائیں۔ اس کا مطلب تھا تین ہزار، اور سیتا عرف موہنی کو کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں بھیجنا تھا۔ لکشمی خوب جانتی تھی کہ فائیو اسٹار ہوٹل میں خرچ کرنے والے کے پاس یا تو سرکاری پیسہ ہوتا ہے یا نمبر دو کا۔ اس لیے وہ خاموش رہ کر رقم میں اضافہ کرتی چلی جا رہی تھی۔ ڈر بھی رہی تھی کہ کہیں کوئی لفڑا نہ کھڑا ہو جائے۔ اُس آدمی نے کہا:

"وہ کسی ملک کا شہزادہ ہے۔ بڑا آدمی، بہت بڑا آدمی ہے۔ اب چار پہ راضی ہو جا، باقی میں سنبھال لوں گا اور تیرا آدمی بھی رہے گا۔ اور یہ برقعہ اس کو اُڑھا دے اور ساتھ کر دے۔"

لکشمی خاموش بیٹھی رہی تو وہ آدمی ذرا غصہ ہوا اور بولا:

"تو بہت حرامی ہے۔ لے سالی اب پانچ پورے لے لیں اب تو خوش ہے نا! چل جلدی۔ امو کو بتا دینا باہر نکڑ پہ سفید رنگ کی امبیسڈر کھڑی ہے۔"

لکشمی موہنی کے کیبن میں گئی۔ وہ کسی فکر میں ڈوبی ہوئی لیٹی تھی۔ لکشمی نے کہا:

"بیٹی! لیٹے لیٹے تھک گئی ہو گی، ذرا گھوم پھر کر آ، بمبئی تو رات میں ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔"

پھر اُس نے امو کو آواز دی جو اس آواز کا منتظر تھا۔ امو جب اندر گیا، تو لکشمی نے اُسے دو سو کے نوٹ دیتے ہوئے کہا:

"میری موہنی کو بمبئی گھما لا۔ اور بڑے ہوٹل میں کھانا کھلا۔ اس کا جو بھی من چاہے دلا دینا۔ باہر سفید امباسڈر کھڑی ہے اُس میں جانا۔"

موہنی اٹھی اور باہر جانے لگی تو لکشمی نے کہا:

"بیٹی کسی کی نظر نہ لگے اِس لیے یہ برقعہ پہن کر جا۔ یہاں لوگ اچھے نہیں ہیں۔"

سیتا نے چُپ چاپ برقعہ اوڑھا۔ جب وہ باہر نکلنے لگے تو سیتا کو احساس ہو گیا کہ وہ ایک جہنّم سے نکل کر دوسرے جہنّم میں پہنچ چکی ہے۔ اُس نے امو کا ہاتھ پکڑ کر کہا:

"یہاں کیا ہوتا ہے؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ مجھے یہاں سے نکالو۔"

امو چُپ چاپ چلتا رہا۔ اس نے باہر دیکھا: ملباری ہوٹل کے قریب نکّڑ پر ایک سفید امبیسڈر کھڑی تھی؛ وہ سیتا کا ہاتھ پکڑ کر مخالف سمت میں بڑھ گیا۔ ایک اندھیری گلی میں مُڑ کر اس نے سیتا سے کہا:

"دیکھ یہ ایسا نرک ہے جس میں پھنسنے کے بعد آدمی نِکل نہیں سکتا۔ ایک ہی راستہ ہے کہ تو بھاگ چل۔ مَیں تجھے تیرے گاؤں پہنچا دوں گا۔"

سیتا چلتے چلتے رُک گئی۔

"میرے گاؤں نہیں، تیرے گاؤں۔ میرا گاؤں بھی ایسا ہی نرک ہے۔" سیتا نے بڑے اعتماد سے کہا۔

امو نے کہا:

"سوچ لے، میرا نام امتیاز خاں ہے اور تُو سیتا۔"

سیتا نے جُھک کر اُس کے پیر چھوئے اور کہا:

"تُو جو کوئی بھی ہے میرا دیوتا ہے۔ کیوں کہ اتنے لوگوں میں تُو ہی اِنسان نظر آتا ہے۔ تُو جہاں چاہے لے چل، مَیں تیرے قدموں میں اپنی زندگی گزار لوں گی۔"

وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اندھیرے میں بڑھتے چلے گئے۔ دونوں

کے چہروں کی چمک اندھیرے میں بھی ایک دوسرے کو نظر آ رہی تھی۔

سیتا کا چہرہ جہنم سے نکل کر جنّت کی طرف جانے کی خوشی میں چمک رہا تھا، اور رامو کا ـــــ اِس لیے کہ وہ آج پھر امتیاز خاں بن کر اپنے گاؤں لوٹ رہا تھا، اور اپنی گزری ہوئی ذلیل زندگی کا کفّارہ بھی ادا کر چکا تھا۔

●●

۴ لیکن یار.....!

"کیا تُم سچ کہہ رہے ہو؟"

"ہاں!"

"میرا مطلب ہے ایسا ہی ہُوا تھا جیسا کہ تُم بتا رہے ہو؟"

"بھئی مَیں نے لفظ بہ لفظ وہی بتایا جو میری آنکھوں نے سرتا پیر دیکھا۔"

"ہاں تم منظر کو لفظوں میں قید کرتے ہو۔ یہ مجھے معلوم ہے۔ لیکن کبھی کبھی دُور کی کوڑی لاتے ہو کہ وہاں تک گمان بھی نہیں پہنچ پاتا۔"

"بھئی مَیں اُس منظر کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ بہتر ہو گا کہ تمہیں وہاں لے چلوں۔"

"ہو سکتا ہے۔ ہو۔ لیکن تم نے تو دیکھا تھا نا اچھی طرح!"

"لو، مَیں نا دیکھتا تو نجات کیسے پاتا۔ دیکھا جب نا بھاگا۔"

"لیکن یار۔ یقین نہیں آتا۔"

"ارے بھئی! اِس دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بڑی رنگ رنگیلی ہے۔"

"تم کم رنگ رنگیلے ہو پیارے۔"

"یار! مَیں پھر وہاں جانا چاہتا ہوں، لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ پکڑ ہی نہ لے۔"

"چلو کسی دن چلتے ہیں یاروں کے ساتھ دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔"

"ہاں ہاں ضرور چلو۔ کسی کی ماں نے ابھی ایسا نہیں جنا کہ وہ ہمیں روک لے یا پکڑ لے۔ سمجھے!"

"تم تو ہمیشہ کمانڈر انچیف بنے رہتے ہو۔"

"تو کیا تمہیں اس سے کم دکھائی دیتا ہوں؟"

"لو! گلے ہی پڑ گئے۔ یار تم کمانڈر انچیف اور تمہارے والدِ بزرگوار بریگیڈیر۔ بس۔"

"دیکھو ہمیں چاہے جو کہو لیکن والدِ بزرگوار تک نہ پہنچو، ورنہ ہمارا جلال کمال کو پہنچے گا اور تمہارے جمال پر اثر انداز ہوگا۔"

"اب یہ بھی چھوڑو ولی صاحب۔ ہاں تو کب چلا جائے؟"

"لیکن یار سوچو ایسا ہو سکتا ہے؟"

"یار اپنی کھوپڑی تو تمہارے اتنی نہیں چلتی۔ سالا آج کل اناج بھی اپنی مٹی کا نہیں رہ گیا ہے۔ اس میں کس بل ہے ہی نہیں۔"

"یار تو ہی بتا کب چلیں۔ وہاں جب تک نہ جائیں سمجھ میں خاک نہیں آئے گا۔"

"چلو! کہاں چلنا ہے؟"

"آتے ہی چلنے کی تیاری۔ بیٹھو ذرا دم لو۔"

"تم لوگوں کو زندگی کا مطلب ہی نہیں سمجھتا۔ دوڑنا، جھپٹنا، مڑنا، مڑ کر پھر جھپٹنا زندگی کا نام ہے، اور تم سالے پھسڈی خاں۔ جب ایک جگہ بیٹھ جاتے ہو تو کانا پھوسی میں اپنا سارا وقت گنوا دیتے ہو۔"

"ذرا جھپٹ کر اور مڑ کر تو بتاؤ تاکہ ہم بھی تقلید کریں جھپٹ خاں کی۔"

"ذرا وقت تو آنے دو۔"

"وقت کب آئے گا؟"

"جب میری محبوبہ کا باپ اس کی شادی میرے ساتھ کرنے سے انکار کردے گا، تو ایسا جھپٹوں گا اور اُسے لے کر اڑ دوں گا کہ تم سب دیکھتے رہ جاؤ گے ۔"

"خیر ٹھاؤ اس بات کو۔ تم لوگ بتاؤ کیا چکر چل رہا ہے۔"

"یار تمہیں یقین نہیں آئے گا؟"

"کیا بہت بدیقینی والی بات ہے؟"

"بات تو کچھ ایسی نہیں ہے، لیکن ہے کچھ ایسی ہی۔"

"ارے تو بتاؤ نا بھائی کیا بات ہے؟ پہیلیاں کیوں بجھا رہے ہو؟"

"بجھانا محاورہ ہے۔"

"اب سب چلتا ہے۔ ٹوٹاؤ کا وقت آگیا ہے۔ قطع و برید جائز ہے سمجھے!"

"کیا کہا؟ قطع و برید!"

"کیا اُس کے ساتھ قطع و برید ہوئی؟"

"یار کیوں اشتیاق بڑھا رہے ہو؟ بتاؤ نا کیا بات ہے؟"

"لیکن یار تم یقین نہیں کرو گے!"

"پھر وہی بات۔ مَیں کہتا ہوں اگر مَیں نے یقین کر ہی لیا تو!"

"ہم جانتے ہیں تم یقین نہیں کرو گے؟"

"ٹھیک ہے۔ مَیں سننا بھی نہیں چاہتا۔"

"تم نہیں مانو گے؟ — اچھا سنو۔"

"سُناؤ۔"

"بات کچھ یوں ہے کہ ....."

"اب سیدھے بولو بھئی! کیوں آڑے ترچھے بھاگ رہے ہو بوگس نقّادوں کی طرح!"

"سنو تو! پرسوں رات کی بات ہے۔ نو دس کا عمل ہو گا مَیں اندرا تیھ سے گز

رہا تھا کہ ایک بہت ہی خوب صورت چاند پری پر نظریں رُک گئیں۔ اُس کے حُسن کے جادو نے نگاہوں کو باندھ لیا تھا۔ نگاہیں اس کے بدن سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔ چاند پری مسکرائی، تو اس کے لبوں پر قوسِ قزح کے ساتوں رنگ جھلملا اُٹھے۔ میرے اندر بجلی سی سنسنانے لگی۔ مَیں نے جواب میں مسکرانے کی کوشش کی لیکن مسکرا نہ سکا۔ تھوڑی دیر بعد قریب بُلایا تو میری سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔ مَیں کبھی کبھی تیز کبھی آہستہ چلتا ہُوا اس کے قریب پہنچا تو اس کے حُسن کی تپش محسوس ہونے لگی۔ اس نے پھول جھڑیاں بکھیرتے ہوئے پوچھا:

"چلو گے؟"

پھر وہ مُڑ کر چلنے لگے۔ تو مَیں اُس کے پیچھے پیچھے یوں چلنے لگا جیسے مجھے اُسی کے پیچھے چلنا تھا۔ مَیں تو چل رہا تھا لیکن اُس میں کھو گیا تھا۔ اس کی چال بھی ستم ڈھا رہی تھی کہ ہر قدم پر نئے نئے قوس جسم پر بنتے تھے اور میرا دل دھڑک دھڑک اُٹھتا تھا۔ چلتے چلتے وہ مُڑ کر مجھے دیکھتی تو یوں محسوس ہوتا کہ اچانک بدلی سے چاند نکل آیا ہے۔

وہ اندرا پتھ سے ہٹ کر ایک گلی میں مُڑی تو مَیں بھی مُڑ گیا۔ تھوڑی دُور جا کر اس نے رُک کر ایک دروازہ کھولا اور اندر جا کر ایک پلنگ پر شہزادیانہ انداز میں نیم استراحت حالت میں یوں بیٹھ گئی تھی کہ وہ سارے قوس جو ابھی تک چھپے ہوئے تھے، وہ بھی اُبھر کر آ گئے اور جسم بول اٹھا ..... آؤ ..... ! ایک تو کندن کی دمک اُس پر قاتلانہ انداز!

ارے یار! مَیں کیا بتاؤں، اُس کی کٹورا سی شفاف آنکھوں میں روشنی کی لویں لپک لپک جاتی تھیں۔ اُس کے شفق سی لالی چھوڑتے گال قریب تر ہونے کی دعوت دیتے تھے۔ اور ہونٹ ..... اُف! گلاب کی پنکھڑیاں یاد آ جاتی تھیں ....."

"ابے عورت کا حُسن بیان کر رہا ہے کہ میر کا شعر۔"

"بیٹا! وہ بڑا کڑا وقت ہوتا ہے۔ میر غالب کوئی یاد نہیں رہتا۔ تم ہوتے نا میری جگہ، تو حُسن کی دیوی کہہ کر پیروں میں گر پڑتے۔ پیر بھی بڑے خوب صورت تھے سالی کے۔"

"پھر کیا ہُوا؟"

"مَیں دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھا۔ ہاتھ اُس کے ہاتھ پر رکھا تو وہ مسکرا اٹھی۔ میرے دِل کی دھڑکن کچھ کم ہوئی اور ہمت بڑھی تو مَیں نے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ کیا بتاؤں! اتنے حسین اور نرم ملائم جیسے ریشم! تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے آپ کو کپڑوں سے آزاد کرنا شروع کیا۔ جب اُس نے سارے کپڑے اُتار لیے اور صرف برلیسیر رہنے دیا تو مَیں نے چاہا کہ یہ بھی اُتروا دوں۔ لیکن مَیں نے ہی اس کا کلپ اپنے ہاتھوں سے کھول دیا تو معلوم ہے کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟"

"برلیسیر کے ساتھ اُس کے خوبصورت پستان بھی نیچے گر گئے۔ اس کا سینہ بالکل سپاٹ تھا۔ صرف دو کالے بدنما دائرے تھے وہاں۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی ساری خوبصورتی بھی اُس کے پستان کے ساتھ گر گئی اور میرے اشتعال پر بھی برف سی جم گئی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میں تمہیں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ تمہیں یقین نہیں آئے گا۔"

"بھئی! تم نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا نا کہ وہ عورت ہی تھی۔"

"ہاں وہ عورت ہی تھی اتنی ہی جتنے سچ تم مرد ہو۔"

"تم نے اس سے کچھ پوچھا نہیں؟"

"پوچھا تھا۔"

"کیا بتایا تھا اس نے؟"

"جیسے ہی اُس کے پستان نیچے گرے، وہ چیخ کر گر پڑی اور مُنہ ڈھانپ کر بولی: تم نے مجھے ننگا کر دیا۔"

"لیکن وہ تو کپڑے اتار چکی تھی نا؟"

"برلیسیر سے اس کا عورت پن ڈھکا رہتا تھا۔"

"اچھا۔"

"مجھے بھی افسوس ہوا کہ اُس کا سارا حُسن بکھر گیا۔ جیسے اُس کے سینے پر دو سیاہ دائرے تھے بالکل ویسی ہی سیاہی اس کے چہرے پر بھی دوڑ گئی تھی۔ مَیں نے اس سے پوچھا:

"ایسا کیوں ہوا؟"

تو اُس نے بتایا:

"جس نقلی چیز کو تم نے گرا دیا ہے وہ پہلے اصلی تھی۔ میرے انگ کا حصّہ تھی، لیکن شہر بے شہر کے لوگ اسے نوچ لے گئے۔ جو بھی آتا اِسی پر حملہ آور ہوتا۔ اس طرح یہ پستان بوٹی بوٹی بکتے چلے گئے۔ لوگوں میں بٹتے چلے گئے۔ تم نے دیکھا کہ انہیں سے میرا حسن قائم ہوتا ہے۔ اِسی لیے مَیں نے نقلی پستان بنا لیے — اب کیا کر سکتی ہوں۔" اس کی آنکھوں میں موتی جھلملا رہے تھے۔

"مَیں نے اُس کا بریسیر اُٹھایا۔ اُس کے سینے پر اُسے ٹانگ دیا اور باہر نکل آیا۔"

"لیکن یار ......"

••

۵ پرندوں کی ڈار اور پاگل

اُس کے بارے میں باتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایسے ہی جیسے کسی انتہائی معمولی اور کسی غیر معمولی شخصیات کے بارے میں پھیلتی ہیں اور پھیلتی ہی چلی جاتی ہیں۔

وہ کہاں سے آیا تھا کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیکن جب اُس کی بات چلتی تو بعض لوگ یوں بات کرتے جیسے وہ اُس کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے ہوں یا اُس کی سات پشت سے اس کا شجرہ جانتے ہوں۔ وہ کہتے:

"ہم اُسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ جب شہر میں داخل ہُوا تھا تو اس کے دونوں کندھوں پر دو کبوتر پھڑپھڑاتے تھے۔ اور معلوم ہے وہ کہاں سے آیا تھا؟ دوسرے شہر سے۔ وہاں جلّادوں نے، فسادیوں نے اُس کے بچّوں کو، بیوی کو، پورے خاندان کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ یہ جب گھر میں داخل ہُوا تو بے ہوش ہو کر گر گیا تھا۔ پتہ نہیں کب تک بے ہوش رہا کہ اُس کے کبوتروں نے کابک سے کسی طرح آزادی حاصل کی اور اس کے چہرے پر اپنے پروں سے ہوا دے دے کر اسے ہوش میں لایا۔ ہوش میں آتے ہی وہ چل پڑا تو وہ دونوں کبوتر اس کے دونوں کندھوں پر بیٹھ گئے۔"

اتنی لمبی تقریر کرنے کے بعد وہ ہانپ گیا تھا۔ اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے ابھی تک بے تاب تھے اور آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ کہانی کا اگلا حصّہ سوچ رہا ہے۔ لیکن وہ جیسے ہی چُپ ہُوا، دوسرا بآوازِ بلند شروع ہو گیا:

"اور تم لوگوں کو معلوم ہے وہ سیدھا اپنے شہر میں داخل ہوا تو پُرانے قلعے کے بُرج کا پتہ بھی اس کے کندھے پر سوار دونوں کبوتروں نے اُسے دیا، جہاں کبوتروں کی ڈار رہتی ہے۔ تب سے وہ اسی بُرج کے کبوتروں کا رکھوالا، پالنے والا، سنبھالنے والا، مالک، نوکر سب کچھ ہے۔ اگر کسی نے کبوتروں کی طرف تیز آنکھ سے بھی دیکھا تو وہ بھانپ جاتا ہے کہ دیکھنے والے کی نیت ٹیڑھی ہے کہ سیدھی۔"

جو پہلے بول رہا تھا وہ دوسرے بولنے والے کو خشمگیں نظروں سے دیکھ رہا تھا، جیسے ہی وہ خاموش ہوا تو وہ جھٹ سے بولنے لگا:

"بے چارہ اب کبوتروں میں ہی رہتا ہے۔ پورا شہر جان گیا کہ یہ صرف کبوتروں کی زبان ہی سمجھتا ہے۔ دن بھر پیسہ جمع کرتا ہے اور کبوتروں کے لیے کھانے کا انتظام کرتا ہے صبح شام ان کو پانی پلاتا ہے، بیٹ صاف کرتا ہے، اور تھک تھکا کر بُرج کے پیچھے ایک کونے میں سو جاتا ہے۔ کبوتروں کے لیے لائی ہوئی غذا کی تھیلی ہاتھ میں ہوتی ہے۔ صبح صبح جب کبوتر تھیلی کھینچتے ہیں تو وہ ہنستا ہوا جاگ جاتا ہے، اور کبوتروں کی خدمت میں جُٹ جاتا ہے۔ بے چارہ!"

اب شاید اُن دونوں کے پاس بتانے کے لیے کچھ اور نہیں بچا تھا اس لیے وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ سُننے والوں میں سے ایک نے سوال کیا:

"مگر وہ ہر موسم میں وہیں رہتا ہے۔ کیا موسم کے اثرات اس پر نہیں ہوتے؟"

دونوں بولنے والے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر دوسرے نے کہا:

"بھئی وہ پاگل ہے۔ موسم کے اثرات اس پر نہیں ہوتے۔"

سُننے والوں میں سے دوسرے نے کہا:

"مگر وہ پتھر تو معلوم نہیں ہوتا۔ وہ ہم انسانوں سے نرم دل انسان ہے تبھی تو اُس نے کبوتروں کی ڈار کے سائے میں رہنا پسند کیا ہے۔ انسانوں کی کٹ اور چھل سے دُور، انسانی سازشوں سے دُور۔"

وہ سب خاموش ہو گئے۔ دونوں بولنے والوں کو بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کیا بولیں۔ اس لیے وہ دونوں بھی خاموش ہو کر یک ٹک سامنے سڑک پر دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ پاگل انہیں نظر آیا۔ ہاتھ میں ایک تھیلی تھی میلی چکٹ، اور گلے میں بھی جھولی لٹکی ہوئی اس کا رنگ اور اس کی پھٹی ہوئی قمیض کا رنگ بھورا تھا۔ مونڈھوں پر بس سلائی اٹکی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ سے کپڑا پھٹ چکا تھا۔ پاجامے کا بھی وہی حال تھا۔ کالا چکٹ اور جگہ جگہ سے پھٹا ہوا اور اُدھڑا ہوا۔

اس کے پیر، ہاتھ اور بدن کے دوسرے کھلے ہوئے حصّوں کا رنگ کپڑوں کے رنگ سے مل گیا تھا۔ سر اور داڑھی کے بال آزاد تھے، اس لیے دونوں میں بے ترتیبی یکساں تھی۔ وہ بولتا بھی نہیں تھا۔ صرف اپنی خوف زدہ پیلی پیلی بار یک آنکھوں سے دکاندار کی طرف یک ٹک دیکھتا تھا۔ کچھ لوگ مارے نفرت کے اس کو جلدی بھگانے کے لیے کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے اور کچھ خوف کی وجہ سے۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز، ہر آہٹ سے بے خوف، گالی اور جھڑکی کو بے اثر کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

اس کی جھولی اور تھیلی کا پیٹ پھولتا جا رہا تھا۔ وہ ریزگاری سمیت ہر چیز تھیلی میں ڈال لیتا تھا۔ لیکن روٹی گلے میں لٹکی جھولی میں ڈالتا تھا، جو اس کی خوراک تھی۔

دیکھنے والے اُسے دیکھتے تو انہیں نفرت، ہمدردی، غصّے کا احساس ہوتا۔ لیکن وہ ان تمام جذبوں سے کب کا نجات پا چکا تھا۔ وہ تو صرف کبوتروں کا دوست تھا۔ ان کی بولی، ان کے جذبے، ان کی تندرستی اور بیماری کو سمجھتا تھا۔

وہ اب ان کے قریب آتا جا رہا تھا۔ ایک بولنے والے کی نظر اس کے گلے میں لٹکی جھولی پر پڑی تو اس نے کچھ یاد کر کے بولنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا:

"ہاں! وہ جو اُس کے گلے میں لٹکی ہوئی جھولی ہے نا اس میں وہ صرف اپنی روٹی رکھتا ہے، اور ایماندار اتنا کہ وہ دیکھ لیتا ہے کہ روٹی دو وقت کے لیے کافی ہے تو وہ روٹی قبول نہیں

کر بائروٹی دیکھ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔"

ایک بولا:

"یعنی اُس کو وقت کا بھی احساس ہے؟"

"ہاں بھئی! احساس کیوں نہ ہوگا؟ وہ بھی انسان ہے۔ بس ذرا چکر میں آگیا ہے۔ اُفتاد ہی ایسی پڑی تھی بے چارے پر!"

وہ اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن سب کو اُس سے اچانک نامعلوم سی ہمدردی ہوگئی تھی، لیکن اُن میں کوئی بھی مطمئن نہیں تھا۔ اُس کے بارے میں مزید کھوج اور سراغ لگانا چاہتے تھے۔ وہ کون تھا؟ کیا نام ہے؟ کیسا رہتا ہے؟ ایک بالکل معمولی شخصیت کے بارے میں ان کا تجسس فطری تھا۔ مگر جو لوگ یوں بولتے تھے جیسے وہ اس کے کلاس میٹ رہے ہوں اور اُس کے قدم سے قدم ملا کر اِس شہر میں آکر انھوں نے ہی اُسے قلعے کے بُرج کے نیچے آباد کرایا ہو، ان کے جھوٹ کا تانا بانا فوراً بکھر جاتا تھا، اور سچائی باہر آجاتی تھی کہ یہ کچھ نہیں جانتے، سُنی سُنائی اُڑاتے ہیں، اُس میں اپنی طرف سے کچھ گل بوٹے کھلاتے ہیں۔ کچھ نمک مرچ ملاتے ہیں۔

ابھی وہ بالکل چار پانچ دُکان دُور ہی تھا کہ بازار میں بھگدڑ مچ گئی۔ بھاگو، مارو، کاٹو ..... دھڑا دھڑ دکانیں بند ہونے لگیں، کچھ لُوٹنے لگیں، پتھراؤ ہونے لگا۔ پتھراؤ کرنے والے یہ جانے بغیر پتھراؤ کر رہے تھے کہ وہ کس پر پتھراؤ کر رہے ہیں، مخالفین پر یا اپنوں پر۔ یہاں ان کا مقصد صرف پتھراؤ کرنا ہوتا ہے، چاہے جس پر ہو۔ چند ہی منٹوں میں بازار سنسان ہوگیا۔ صرف پولس کی گاڑیاں دوڑنے لگیں۔

اُس نے اِدھر اُدھر نہیں دیکھا۔ سیدھا قلعے کی جانب چل پڑا۔ اچانک اس کے سامنے پولس کی گاڑی آکر رکی۔ دو تین پولس مینوں نے اُسے پکڑا اور اٹھا کر دین میں ڈال دیا۔ اب گاڑی کا رُخ پولس اسٹیشن کی جانب تھا۔

پولس اسٹیشن پہنچنے کے بعد اُسے لاک اپ میں ڈال دیا گیا۔ وہ چپ تھا۔ اب بھی اس کے ہاتھ میں ہتھیلی تھی اور گلے میں جھولی تھی۔ چند گھنٹوں کے بعد اس پر فساد برپا

کرنے کی تعزیرات عائد کرنے کے بعد تفتیش ہونے لگی۔ اُسے ایک کوٹھری میں لے جایا گیا، جہاں کئی پڑھے لکھے آفیسر اور پولس مین بیٹھے تھے۔

ایک نے پوچھا:

"کون ہو تم؟ کیا ہے اس تھیلی میں؟"

اُس نے پہلے سوال کا جواب نہیں دیا۔ دوسرے سوال کا جواب دیا۔ برسوں بعد اس کو کسی بات کا جواب دینا تھا۔ وہ اٹک اٹک کر بولا:

"بچّوں کا کھانا ہے صاحب .... میرے بچے بھوکے ہیں۔"

"کہاں ہیں تیرے بچّے؟" ایک کرخت آواز اُبھری۔

"قلعے کے بُرج میں۔" اُس نے بلا خوف دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"اور کیا ہے وہاں؟" دوسری کرخت آواز اُبھری

"میرے بھوکے بچّے۔" اُس نے جواب دیا اور ٹکر ٹکر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

پھر ایک آواز اُبھری:

"تو نے بازار میں کتنی دکانیں پھوڑ دیں؟"

وہ بازار، دکان، اور دکان کا پھوڑنا سب کچھ بھول چکا تھا۔ اس نے اس سوال پر خاموشی اختیار کر لی، تو اسے چاروں طرف سے لاتوں، گھونسوں، تھپڑوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر مار پر وہ ہل ہل جاتا۔ لیکن تھیلی پر اُس کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی تھی۔ ایک آفیسر نے کہا:

"اس کی تھیلی میں ہتھیار معلوم ہوتے ہیں۔"

اتنا سنتے ہی ایک پولس مین نے اس کے ہاتھ سے تھیلی جھپٹ لی، دوسرے نے گلے سے جھولی اتار لی اور دونوں کو ٹیبل پر خالی کر دیا۔

تھیلی میں سے چنے کی دال، ریزگاری، پیسے، چاول، گیہوں کے دانے نکلے۔ اناج کے دانے چکنے ٹیبل پر پھیل چکے تھے۔ ریزگاری کے چند سکّے لڑھکتے ہوئے ٹیبل سے نیچے گر کر ہلکے ہلکے جھناکے پیدا کر رہے تھے۔ جھولی میں سے سوکھی روٹی کے ٹکڑے، پاؤ بھر کے چھوٹے

چھوٹے ٹکڑے نکل کر بھیل گئے۔ سب لوگ بھونچکا ہو کر یہ سب چیزیں دیکھ رہے تھے۔

"چلو اس کے گھر کی تلاشی لو۔ اس کو رسّیوں سے باندھ لو۔ بھاگنے نہ پائے۔ اس نے ضرور کوئی سازش رچی ہوگی۔ بہت ہوشیار بنتا ہے سالا۔"

اس نے جھپٹ کر اس کے بچوں کا کھانا تھیلی میں بھرا۔ اور اپنے سوکھے ٹکڑے جھولی میں بھر کر گلے میں لٹکا لی۔ تب تک رسّی لے کر دو تین پولس مینوں نے اس کو باندھ دیا اور گاڑی میں ٹھونس دیا۔

قلعے کے دروازے پر گاڑیاں رُک گئیں۔ اُسے اُتارا گیا۔ وہ آگے بڑھا اور بُرج کی طرف جانے والی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ اُس کے پیچھے پولس میں ہوشیار اور چوکس بندوق تانے ہوئے، جیسے وہ کسی دشمن کی فوج پر حملہ کرنے جا رہے ہوں، بڑھنے لگے۔

اب کبوتروں کی غٹرغوں غٹرغوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ کبوتروں نے جوں ہی اُسے آتے دیکھا اُڑ اُڑ کر اس کے بازو، سر اور ہاتھوں پر بیٹھتے تھے اور غٹرغوں غٹرغوں کر کے جیسے سوال کر رہے ہوں ــــ "آج اتنی دیر کیوں لگا دی؟ آج اتنی دیر کیوں لگا دی؟" کبوتر اُسے ٹھونگیں مار رہے تھے جیسے دیر سے آنے پر احتجاج کر رہے ہوں۔ کچھ تھیلی کھینچ رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں ــــ "ہم بھوکے ہیں۔" پوری ڈار اس کے اِرد گرد جمع ہو گئی تھی۔

اُس نے کبوتروں کی طرف مسکرا کر دیکھا اور بلند آواز سے کہا:

"یہ ہیں میرے بچے۔ مَیں کب کا انسانوں سے ناطہ توڑ چکا ہوں۔ انسان خونی ہے انسان کائر ہے۔ انسان سازشی ہے۔ انسان کے پاس بندوق ہے۔ حق مانگنے پر گولی ہے۔ یہ میرے بچے ان سب باتوں سے دُور ہیں۔ میرے ہاتھ کھول دو۔ میرے بچے بھوکے ہیں ــــ ان کو کھانا کھلانا ہے۔"

ایک آفیسر نے اشارہ کیا۔ رسّی کھول دی گئی۔ اُس نے بُرج کے وسط میں جا کر تھیلی ابھر دی اور کبوتروں کی اُڑتی ہوئی ڈار کو آوازیں دینے لگا:

"آ۔ آ۔ آ۔"

پولس والے چند منٹ دیکھتے رہے، پھر واپس ہو گئے۔

فساد کی سازش میں پکڑا جانے والا کوئی نہ تھا۔ اسی فکر میں وہ پریشان پریشان لوٹ رہے تھے۔

••

٦ ایک قصّہ

"تو!"

"تو کیا؟"

"بس قصّہ ختم ہوا!"

"ایں!"

"ابھی کہاں ختم ہوا؟"

"اب کیا تمہاری قسم کھاؤں؟"

"اچھا جانے دو یہ قصّہ، دوسرا سنادو"

"تم سمجھتے ہو میں نے قصّے بنانے کی فیکٹری کھولی ہے۔"

"تم قصّے جمع کرتے ہو اسی لیے سُنانے کے لیے کہتے ہیں۔ نہ سناؤ تو..... لیکن ہمیں معلوم ہے کہ تم بات بات میں ایک قصّہ سُنادو گے۔"

"بہت عقل مند ہو یار!"

"لو! اب اس میں عقل مندی کی کیا بات ہے؟"

"خیر سنو! وہ جو میرے سامنے رہتا ہے نا مجو، اس کے گھر تماشہ ہو گیا۔ مجو کی نئی نویلی دلہن نے مجو کی بہن سے شکایت کی کہ سامنے والا آدمی اس کی طرف دیکھتا ہے۔ مجو کی بہن نے دلہن سے پوچھا: تجھے کیسے معلوم ہوا کہ وہ تجھے دیکھتا ہے؟ تو دلہن نے جواب دیا:

مَیں بھی دیکھتی ہوں۔"

بس پھر کیا تھا۔ لگا دی آگ نند بجلی نے۔ بہن نے مجو سے کہا: دیکھ رے مجو! تیری رانڈ سامنے والے سانڈ کو تاکتی ہے۔ بے چاری نئی دلہن کو مجو نے پیٹ کر رکھ دیا اور کہا: خبردار! جو اِدھر اُدھر تاکی تو آنکھ پھوڑ ڈالوں گا حرام زادی۔"

"پھر کیا ہُوا؟"

"یار! یہ تمہارا پھر کیا ہوا، مجھے بہت غصّہ دِلاتا ہے۔"

"اچھا تو آگے بولو۔"

"آگے اندھیرا ہے کچھ دِکھائی نہیں دیتا۔"

"یہ تمہارا حرامی پن اچھا نہیں لگتا۔ سالے عین کلائمکس پر کہانی بنا کلائمکس کے ختم کر دیتے ہو، اور کہانی کو مونڈی بکری بنا دیتے ہو۔ اب سینگ اگا یا کر سینگ۔"

"ابے گورے کی اولاد! کچھ آگے بھی سوچا کر۔"

"یار! تو ادھورے قصّے نہ سُنایا کر۔ سالا ذہن بھٹک جاتا ہے۔ کہ آگے ایسا ہُوا ہوگا ویسا ہُوا ہوگا۔"

"اچھا تو مَیں کہہ دیا کروں گا۔ جس طرح وہ راج کر رہے ہیں۔ ہم تم بھی یوں ہی راج کریں گے اور سُکھی رہیں گے۔ ہے نا! پھر تیرا ذہن کہیں نہیں بھٹکے گا۔"

"یار تو میرے ذہن کی بات مت کر۔ وہ تو سالا نچلا بیٹھتا ہی نہیں۔ تگنی کا ناچ ناچتا ہے۔"

"محاورہ یوں ہے: نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔"

"واہ رے زباں داں! اب تو کل سے کلاس لیا کر۔"

"مجھے کیا پڑی ہے بوڑھے طوطوں کو رٹاؤں۔"

"ہم بوڑھے ہو گئے ہیں؟"

"پھر نہیں تو کیا؟"

"سالے بوڑھا ہوگا تو، تیرا باپ۔ ابھی تو ہمارے اوپر بہار ہے، نکھار ہے،
کچھ آنکھیں اب بھی تاکتی ہیں۔"
"کس گلی میں، اُس گلی میں نا جس میں ہر آنے جانے والے کو آنکھیں تاکتی ہیں،
بیٹا! شریفوں کے کتے بھی تمہاری طرف تاکنا پسند نہیں کریں گے۔"
"آگئے نا اپنی اوقات پہ رذیلے شریف۔"
"ایسے ہی جلتے رہو رذالت میں، اور ہم اپنی شرافت میں مگن رہیں گے۔"
"یار ہٹاؤ یہ ذاتی حملے۔ کام کی بات کرو۔"
"ان دونوں بے وقوفوں کی موجودگی میں کام کی بات کیا ہو سکتی ہے؟"
"کیا کام کی بات کریں؟ کام کر کرکے تو تھکاوٹ دُور کرنے یہاں آتے ہیں۔ اب
تم یہاں بھی کام کا مقبرہ اُگا دو گے تو پھر ہمارا ہی مزار اُس مقبرے میں ہوگا۔"
"کبھی تو سیدھی بات کیا کرو۔"
"آج کل ایسے ہی انداز میں باتیں ہو رہی ہیں ادب میں۔"
"اب تیری اور تیرے ادب کی تو . . . . !"
"بہت بے ادب ہے۔ یار دیکھ سامنے لکھا ہے۔ یہ شریفوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے
بیٹا یہ بورڈ تمہارے ہی جیسے لوگوں کے لیے لگا ہے کہ غیر شریف یہاں سے کھسک لیں۔ اس شہر کی
سڑکیں کشادہ ہیں کہیں بھی تم اس کا بیوند بن سکتے ہو۔"
"ارے یار تم سیدھے بات کرنا سیکھو۔ تمہارے ساتھ ہم جو بیٹھتے ہیں۔ ہم
انٹلکچولز نہیں ہیں بلکہ اینٹی انٹلکچویل ہیں۔"
"ارے اُس پروفیسر کا کیا ہوا جسے ہم انٹلکچولز آنٹی کہتے تھے؟"
"ہاں یار! بہت دنوں سے نظر نہیں آیا۔ کیا فرفر بولتا تھا۔"
"یہی تو خاص بات تھی کہ لوگوں کو صرف "فرفر" یاد رہ گیا ہے باقی کچھ نہیں۔"
"اب کیا کیا یاد رکھیں۔ سالا انسان نہ ہوا کمپیوٹر ہو گیا۔ مولوی صاحب

کہتے ہیں ضروری سورتیں، کلمے اور مختلف دعائیں یاد کرو۔ گھر والے کہتے ہیں یہ یاد رکھو، وہ یاد رکھو۔ زندگی کہتی ہے مجھے یاد رکھو۔ انسان تو سالا سبھی کا قرض دار ہے۔"

"ایک بات نکلی تھی ذرا سی۔ تم نے اُسے بالنس بنا دیا۔"

"آج کل یہی ہو رہا ہے۔"

"کہاں ہو رہا ہے؟"

"ابے یہاں ہو رہا ہے۔ وہاں ہو رہا ہے۔ سبھی جگہوں پر ہو رہا ہے۔"

"ابے وہ تیرا قصہ مکمل ہوا کہ نہیں؟"

"کون سا؟"

"وہی ــــ جو تو سنانے والا تھا۔"

"ابے کہاں سُنانے والا تھا؟"

"لو اب بتاؤ۔ خود ہی بولتا ہے اور خود ہی پوچھتا ہے۔"

"ہاں وہ ــــ وہ قصہ بہت طویل ہے۔"

"کتنا طویل ہے؟"

"بہت طویل ہے۔"

"ابے میں پوچھتا ہوں طوالت کی کوئی حد ہے کہ نہیں؟"

"نہیں ہے۔ بحرِ بے کنار۔ یہاں سے وہاں تک، وہاں سے یہاں تک۔"

"بند کرو یہ تک بندی۔ چلے ہیں سالے شاعری میں باتیں کرنے ــــ یار ایک بات کہوں؟"

"کہہ۔"

"آج کل تو نے مرچ زیادہ کھانا شروع کر دی؟ عورتوں کی طرح پارہ چڑھ جاتا ہے۔"

"ابے ڈفر! عورتوں میں پارہ ہوتا ہی کہاں ہے جو چڑھے!"

"پھر کیا ہونا ہے؟"

"بھیجے میں بھوسہ اور ناک پر غصّہ!"

"بہت پُرانی بات ہے۔ آج کل بھیجے میں عقل آتی ہے اور ناک پر مکھیاں بھی بیٹھتی ہیں۔ تاکہ ہمدردی میں رومال ہلائیں۔"

"اور تیرے جیسے بے وقوف غلاموں کی کمی بھی نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"ہاں یار! بغیر عورت کے تو کچھ نہیں ہوتا۔ تو نے وہ کہانی نہیں پڑھی پُرانی۔ عورت دیوتاؤں تک کو تگنی کا ناچ نچا دیتی ہے، بٹیا جی!"

"کہانی پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ تو ہمارے سروں پر سوار ہے، اور ہم سب تگنی کیا بلکہ چوگنی کا ناچ ناچ رہے ہیں۔"

"یار! تو وہ قصّہ شروع کر۔"

"جانے دے پھر کبھی۔"

"تھوڑا بہت اس وقت۔"

"ارے یار وہ یوں ہے!"

"ایک بادشاہ تھا۔ ہمارا تمہارا بادشاہ۔ اُس نے منّت مانی کہ کوئی اولادِ نرینہ ہو، اور اس کے گھر چراغ جلے۔ لیکن اس کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس بادشاہ نے لڑکی کی پرورش لڑکوں جیسی کی۔ اور جب بادشاہ مرا تو وہ جانشیں ہوئی۔ اور اپنے آپ کو شہنشاہِ وقت کہنے لگی۔ اُس کے قہر سے بڑے بڑوں کے تاج و تخت تھرتھرا جاتے تھے۔"

"ابے تو کیا وہ اپنے تخت پر ہی قہر توڑتی تھی؟"

"یار تو پہلے قصّہ سمجھا کر پھر بولا کر۔"

"ابے یہ چخ چخ بند کرو اور قصّہ جاری کرو، ورنہ ہم سب اُٹھ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے بھلے مانسو! اُسنے جاؤ ان کی بکواس۔ یہ جو بولیں سُن لو۔"

"ابے ہم سُنیں گے تو کون ہوتا ہے روکنے والا۔ سالے ریڈیو سے کیسی کیسی نافلط ناخلف آوازیں آتی ہیں وہ تو سُن لیتا ہے اور یہاں یہ تنقید کرتا ہے۔ سالا خبیث، نقاص ہے، تنقیص کرتا ہے۔ تنقید تو ان کے باوا جان کو بھی نہیں آتی۔"

"اچھا سنو!"

"وہ چار فٹ بھر کی شہنشاہ عورت اپنے سے بڑا کسی کو مانتی ہی نہ تھی۔ اپنے آگے کسی کو جانتی ہی نہ تھی، جب اپنے اقتدار کو خطرہ دیکھتی تو کسی کو پہچانتی ہی نہ تھی۔ سبھی کو ایک لکڑی "حکم" سے ہانکتی، کسی کے منہ میں نہ جھانکتی۔ کوئی زیادہ سیانا بننے کی کوشش کرتا تو اسے دن میں تارے دکھادیتی، بے حیا ہے کو تانڈو ناچ نچادیتی۔ پھر وہ بھی اس کی گن گان منڈلی میں کھو جاتا۔"

"ہوا یوں کہ ایک بار سارے کرم یوگی ایک جگہ مل گئے، اور اپنے اپنے کرموں کا حساب جوڑنے لگے تو پتہ چلا کہ ایک کرم تو انہوں نے کیا ہی نہیں۔ یعنی وہ آپس میں گلے ملے ہی نہیں۔ اور جب وہ گلے ملے تو ان کا لباس دوسرے کے انگ پر چلا گیا۔ کسی کا کمنڈل بدل گیا، تو کسی کا رنگ کسی دوسرے کو لگ گیا۔

جب انہوں نے یہ سچویشن دیکھی تو گھبرا گئے ــ تو ایک کہ جس کا سب کچھ سب میں تبدیل ہو گیا تھا تو اُس بڑے کرم یوگی نے کہا:

"اب تو سب کچھ بدل گیا ہے اب تم سب ایک ہو جاؤ۔"

انہوں نے بہت کوشش کی کہ اپنا اپنا سب حاصل کر لیں۔ لیکن کمنڈل ملتا تھا تو مالا نہیں ملتی تھی، مالا ملتی تھی تو چولہ نہیں ملتا تھا، جٹا ملتی تھی تو جنیو نہیں ملتا تھا۔ بے چاروں نے بہت سوچ بچار کیا۔ پھر بڑے کرم یوگی سے کہا کہ: آپ ہمیں اپنی چھتر چھایا میں لے کر مایا جال سے نکالیں اور مایا موہ میں پھنسی جنتا تک پہنچا دیں۔

اُس بھلے آدمی نے سب کے سر پر ہاتھ رکھا اور دُعا دی:

"جاؤ بیٹا! میرا نام لو۔ رام بلی کریں گے۔"

اس وقت لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ نام اُن کا لیں اور بلی رام کریں گے لیکن وہ مایا موہ سے نکل کر موہ میں ایسے پھنسے تھے کہ کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا، کوئی مسئلہ بوجھتا ہی نہیں تھا۔ وہ سب اس کرم یوگی کا نام لیتے تھے تو اُن کی جبیں روشن ہوتی تھی، ورنہ سدا پھٹکار برستی تھی۔

کرم یوگی نے اُن کے کان میں کہہ دیا کہ ہماری تمہاری شہنشاہ کو بس بھگانا ہے تو اُس بھلے مانس نے کہا۔ اس کام کے لیے بھی تم میرا نام لے سکتے ہو ۔ اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اور شہنشاہ سے مقابلے کی تیاری شروع کر دی۔ اور ایک وقت ایسا آیا کہ کاغذ کے ہتھیاروں نے کاغذ کی بنائی ہوئی شہنشاہ کو شکست دے دی اور کرم یوگی کے پاس گئے، تو اس نے کہا:

"تم نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ اب سب کچھ تمہارا ہے۔ مگر تم اُن اونچے محلوں میں نہ جاؤ، ورنہ کھو جاؤ گے۔" تو وہ چونکے۔

"ارے یہ بڈھا کیا بکتا ہے۔ محلوں میں نہ جائیں۔ تو کیا سڑک پہ بیٹھ کر راج کریں۔"

وہ سب اس یوگی کا مذاق اڑانے لگے۔ کسی نے کہا:

"ارے یہ کون ہے ہم نہیں جانتے۔ اس کا نام لو تو حلق خشک ہو جاتا ہے۔"

اسی لیے وہ اس کا نام ہی نہ لیتے تھے۔

پھر انہوں نے باریک چھپی آنکھوں سے اُن اونچے محلوں کو دیکھا تو اُن کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ اپنے آپ کو اونچی اونچی کرسیوں تک پہنچانے لگے۔

پھر وہ وقت آیا جب وہ محلوں میں پہنچ کر اونچی کرسیوں پر بیٹھے تو کرم موہ کو بھول گئے، تو مایا موہ نے اپنا جال پھیلا لیا۔ کرسیوں پر بیٹھتے ہی انہوں نے اس کرم یوگی کو بھلا دیا اور روز بیٹھ کر حساب جوڑتے کہ آج ہم نے کتنا کمایا اور اسے کہاں گنوایا تو ان

کے ذہن نے مشورہ دیا۔"

"مورکھ! ابھی جتنی روشنی بٹور سکتے ہو، بٹور لو۔ چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات شروع ہوتی ہے۔"

"یہ سنتے ہی اُن کی آنکھیں تجوریوں میں کھُل گئیں تو انہوں نے اپنی تجوریوں کے ہر خانے میں اُجالے کے لیے ہیرے جڑ لیے۔ اب اندھیری رات، دن رات، کیوں نہ رہے انہیں کوئی غم نہیں۔ وہ تو اس سے کوسوں دُور ہو چکے تھے۔"

"پھر یوں ہُوا کہ ایک رات وہ سو کر اٹھے تو ان کی بدلی ہوئی چیزیں سب ان کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ اُن اونچے محلوں میں نہیں تھے بلکہ وہ ان محلوں میں تھے جو انہوں نے اونچے محلوں میں بیٹھ کر اپنے لیے بنوائے تھے

تو انہوں نے سوچا:

"ٹھیک ہے۔ ہم جب تبدیل ہوئے تھے تو کچھ نہ تھا۔ دوبارہ جب تبدیل ہوئے تو زادِ راہ تو ساتھ ہے۔"

بلکہ اتنا کچھ انہوں نے حاصل کر لیا تھا کہ لازوال ہو گئے تھے۔ زوال تو صرف اُن کے اقتدار کو ہی آیا تھا۔ ان کی تجوریوں میں قید اُجالے کو تھوڑے سے ہی آیا تھا۔ باہر پھیلے اُجالے کو آیا تھا اُن کے اندر کے اُجالے کو تھوڑے ہی آیا تھا۔ انہوں نے جنتا کو بھنور میں چھوڑ دیا اور اپنے بنائے ہوئے محلوں میں کھو گئے۔"

"تو پھر آ گئے؟"

"بس یار! یہاں تک ٹھیک ہے۔ کیا اب تم دوبارہ انہیں لانا چاہتے ہو؟"

"یار میری خواہش ہے کہ ایسا ہو۔ وہ واپس آئیں۔"

"لیکن یاد نہیں۔" قصہ گو نے کہا "وہ جادوگر اب ان کے زیر نہیں اور میری رائے ہے کہ وہ کبھی نہیں آئیں گے۔"

"سُنا ہے وہ اپنے بنائے ہوئے محلوں میں کھو گئے ہیں۔"

"اب تم ان سے واپسی کی توقع مت رکھنا۔ اگر وہ باہر قدم نکالتے ہیں تو انہیں اندر کا اُجالا اپنی طرف کھینچ لیتا ہے کہ باہر گھور اندھیرا ہے۔ اور اندھکار سے سے بھگوان بھی ڈرتا ہے۔ پھر وہ کیوں نہ ڈریں۔"

"یار پھر کیا ہوا؟"

"ہوگا کیا۔ یوں ہی چلتا رہے گا۔"

"چلنے دو — اپنے باپ کا کیا جاتا ہے؟"

"چلو گھر چلیں۔ اب تو اندھیرا کافی بڑھ گیا ہے۔"

●●

۷ ایک دِن کا عذاب

اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ کیوں کہ وہ مایوسی کی زمین سے اُگا ہُوا بیج تھا۔
جسے محرومیوں کے موسم نے پالا تھا، اور کالے تاریک ماحول نے اسے جوانی کی سرحد پر لا پٹکا
تھا۔ اب اس کو یہاں سے سفر شروع کرنا تھا۔ لیکن وہ سوچتا کہ اُس کا سفر تو ختم ہو چکا شروع
کہاں سے ہوگا۔ پھر وہ اپنا جائزہ لیتا کہ وہ سفر شروع کر سکتا ہے کہ نہیں۔

کھپچی نما چہرہ، لپ لپاتا بدن، گوشت جیسے دیمک کے گھر کی طرح جھڑ گیا ہو
صرف آثار رہ گئے ہوں۔ آنکھوں میں ماضی وحال کی ویرانی اُتری ہوئی، چہرے پر شدید موسموں
کی کرب ناک تصویریں، سیاہ چہرے میں نقوش چھپے ہوئے ـــ اور کیا تھا اس کے
پاس؟

اُس کا بدن تو بوسیدہ بنگلہ دیش کے امدادی کپڑوں میں چھپا ہوتا، لیکن اس کا
چہرہ ہی تو تھا جو ساری کہانیاں بیان کرتا تھا۔ اَن کہی کہانیاں، اَن کہے واقعات کا مرکب
جن سے وہ مڈبھیڑ کر چکا تھا اور ابھی تک اُن سے ایسا نبرد آزمائی کر رہا تھا کہ وہ اُن کے پیچھے
دوڑ دوڑ کر اپنے لیے نئے کرب اگا لیتا تھا۔ بہت سی نئی کہانیوں میں گھر جاتا تھا۔ ایک کہانی
کے بعد دوسری کہانی۔ لیکن اس کی نئی یا پُرانی کہانی پیار و محبت کی کہانی نہ ہوتی۔ اس
کی سوچ یہاں تک جانے کو تیار ہی نہ تھی کہ اسے اس دشت کا راستہ معلوم ہی نہ تھا۔

اس کی کہانی بس بدن ڈھانکنے اور پیٹ بھرنے تک ہوتی تھی اور پتھر پتھر زندگی

کے پہاڑ پر چڑھائی ہوتی تھی۔ کبھی وہ تھک کر ہانپنے لگتا تھا اور کبھی کانپنے لگتا تھا۔

اس کی آنکھوں کی ویرانی اس بات کی غماز تھی کہ وہ کسی تاریک گوشے سے اچانک نکل کر روشنی کی کرن سے ٹکرا گیا ہو، اور رہی سہی بصارت بھی کھو بیٹھا ہو۔ اور اس کے نتیجے میں اُس کی آنکھیں اندر ہی اندر دھنستی چلی جا رہی ہیں۔ اس کا خون دن بدن جل رہا ہے، کرب کا ایندھن سلگ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک کرب یہ بھی ہے کہ اس نے بیوی سے کبھی سکھ نہیں پایا۔ روشنی تو دور کی بات ہے۔

جب کبھی وہ اپنے ماضی سے نکل کر حال میں داخل ہوتا ہے تو یہاں بھی اُسے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ وہ سوچتا:

"میں اندھیرا ہی دیکھوں گا۔ اندھیرے کے علاوہ یہاں دھرا ہی کیا ہے؟"

"سچ پر لگا کر اڑ چکا ہے۔ اُجالا پریوں کے دیس کی کہانیوں میں جا بسا ہے، اب ہر سوال میں اندھیرا آ بسا ہے۔"

اسے یاد آیا شادی کی پہلی صبح اُس کی بیوی نے اُسے جگا کر پوچھا تھا:

"دودھ کہاں ہے؟"

اتنا سنتے ہی اُسے چکر سا آ گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے اندھیرے کے گولے باہر نکل نکل پڑتے تھے۔ اس کی بیوی سمجھ گئی تھی کہ یہاں دودھ کا نام لینا گناہ ہے۔ تب سے اس نے اپنے لیے ایک تصوراتی تالا خرید لیا تھا جسے وہ ہر اُبھرتی خواہش پر لگا لیا کرتی تھی اور اپنے آپ کو کرب کے موسموں کا عذاب جھیلنے کے لیے آزاد کر دیا تھا۔

وہ جب کبھی بیوی کی طرف دیکھتا تو اسے محسوس ہوتا کہ چہرہ ہٹا کر باقی سارا بدن اس کا ہے۔ کیوں کہ سینے کی گولائیاں جو کبھی انگریزی زیر دیتی تھیں، اب اردو کے صفر میں ڈھل گئی تھیں۔

وہ بیوی کی جون تبدیل ہوتے محسوس کرتا۔ وہ کبھی بیوی کی جون میں چلا جاتا اور اپنی جون بیوی کو دے دیتا۔ جب کبھی رات کی تنہائی میں دونوں کھردرے بدن ایک دوسرے سے

چمٹتے تو یوں محسوس ہوتا کہ دونوں کے بدن کی گرمی چولھے کی آگ نے جلا لی ہے۔ سرد سرد ہڈیوں کے ڈھانچے، کسی لکڑ پھوڑ پرندے کی طرح، سوکھے درخت کی کھال پر ٹھونگیں مار کر چند کٹھیاں نکال کر ہانپنے لگتے۔ پھر اپنی اپنی جھینپ مٹانے کے لیے نیند کی خاموش دلدل میں دھنس جاتے اور عدم تک اترتے چلے جاتے۔ صبح چند لمحے ایک دوسرے سے آنکھیں چُراتے۔

صبح کے پہلے سائرن کے ساتھ وہ چائے تمام تر دب اپنے پیٹ میں انڈیل کر چھوٹے سے ڈبے میں دوپہر کا زہر لے کر نکل جاتا کہ اس کو کئی موڑ کاٹ کر فائلوں کے جنگل میں اُترنا ہوتا تھا۔ جب وہ گھر سے چلتا ہے تو سب کچھ بھول جاتا ہے۔ بیوی، گھر کی تنگ دیواریں، جن پر جالے کسی آرٹسٹ کا بنایا ہوا میورل نظر آتے۔ لیکن وہ سب کچھ بھول کر اپنے آپ کو زندہ بچاتے ہوئے کئی موڑ کاٹ کر آخر فائلوں کے جنگل میں اُتر جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ ہندسوں اور لفظوں کی جڑیں کاٹتا رہتا ہے۔

دن بھر وہ لفظوں کو کاٹتا، ہندسوں کو جوڑتا، کاٹ دیتا، پھر جوڑتا، کاٹتا یوں اس کی زندگی کا ایک دن کٹ جاتا ہے۔ جو کہ لفظوں اور ہندسوں کو کاٹنے سے زیادہ اہم ہوتا ہے......

●●

۸ ذات باہر

دیوگاؤں پہاڑی کے دامن میں ایک ٹیلے پر بسا ہوا ہے۔

اُدھر پہاڑ اور اِدھر ٹیلہ دونوں کے بیچ سے ندی بہتی ہے۔ یہ برساتی ندی ہے، بارش میں منہ زور گھوڑی کی مانند تیز و تند ہو جاتی، بارش کے بعد سوکھ کر بے جان ہو جاتی۔ کہیں کہیں جوہڑ بن جاتے جن میں بھینسیں بیٹھتیں، ڈھور ڈنگر پانی پیتے اور بچے اچھل کود مچاتے۔

دیوگاؤں میں گھاس پھوس کے جھونپڑے ہیں۔ دو ایک گھر کچی دیواروں اور ٹین کی چھت کے بھی ہیں۔ ٹین والی چھت کے گھر اس گاؤں کے امیر کبیر لوگوں کے ہیں، لیکن رہن سہن بول ٹھٹھولی ریت رواج سب کی ایک ہے' اِس لیے گاؤں میں کوئی امیر غریب محسوس نہیں ہوتا۔ سب کی روزی پہاڑی جنگل سے جڑی ہے۔

اس جنگل سے چند لوگوں کے علاوہ سب جلانے والی لکڑیاں، گھاس چرا کر بیچتے ہیں' چند لوگوں میں' دانو ہے جو لکڑیوں سے کوئلہ بناتا ہے، گلامو ہے جو گوند چُراتا ہے' سیامو ہے جو عمارتی لکڑیاں پار کرتا ہے اور بیرو ہے جو پہاڑی دروں میں شراب کی بھٹیاں لگاتا ہے۔ آدھی شراب خود پی جاتا ہے باقی بیچتا ہے۔

گاؤں میں سب کے گھر مٹی کا چولھا ہے۔ ہر ایک کو دوسرے کی خبر ہے اس لیے کوئی بھی ایک دوسرے کی خبر پولیس کو نہیں دیتا۔ پولیس ہے بھی کون سی لبس ایک رکھوالا ہے۔

پہلے گاؤں والوں کو بڑی آسانی تھی۔ گارڈ کے پاس صرف لاٹھی اور سیٹی ہوتی تھی

رات کے وقت جنگلی جانوروں کے خوف سے، روایتی کہانیوں کے بھوت پریت کے ڈر سے جنگل گارڈ خود اپنی کٹیا میں دبکا پڑا رہتا تھا۔ سارے جنگل پر گاؤں والوں کا راج ہوتا تھا۔ کبھی کوئی نڈر قسم کا گارڈ آتا بھی تو وہ جنگلی جانوروں کی آوازیں نکال کر اور مختلف سوانگ بھر کر اسے ڈرا دیتے تھے اور اپنا کام کر کے نکل جاتے تھے۔

سرکار دربار والے سبھی جانتے ہیں کہ جنگل سے چوری کر کے روزی حاصل کرنا ادی باسی اپنا پیدائشی حق جانتے ہیں۔ لیکن سرکار کا بھی فرض ہے کہ وہ جنگل کی حفاظت کرے۔ اس لیے سرکار نت نئے پلان بناتی ہے۔

جب جنگل سے زیادہ چوریاں ہونے لگیں تو چوریوں میں کمی لانے کے لیے سرکار نے اس مرتبہ جو پلان بنایا اس میں گارڈ کو بندوق، کارتوس مہیا کرنا اور تبادلہ کرنا بھی شامل تھا۔ اس پلان کے تحت اس بار جو گارڈ آیا اُس کے کندھے پر چمچماتی کالی بندوق لٹکی ہوئی ہے۔ اس کا نام ہے منارام۔

منارام نڈر بھی ہے۔ وہ جنگل سے واقف بھی ہے۔ جنگل میں شکاری جانوروں کی طرح دبے پاؤں بے آواز چل سکتا ہے۔ جانوروں کی آوازیں بھی پہچانتا ہے۔ رات میں کٹیا کے بجائے بندر کی طرح درخت پر رہتا ہے۔

سب سے بڑا خوف گاؤں والوں کو اُس کے کندھے پر لٹکی بندوق کا تھا۔ ٹوہ میں رہنے والے لوگوں نے پتہ چلا لیا کہ منارام میں کوئی کمزوری نظر نہیں آتی۔ لیکن انھوں نے محسوس کیا کہ وہ گاؤں کے قریب سے آتے جاتے جوان لڑکیوں کو یوں دیکھتا ہے جیسے بوڑھا کسان دودھ دیتی گائے کو دیکھتا ہے۔ کچھ جہاں دیدہ لوگوں کا خیال تھا کہ منارام عورت سے ہی رام ہو سکتا ہے۔

منارام کی بندوق اور اس کی کڑی نگرانی کی وجہ سے سارے گاؤں کی روزی روٹی بند تھی۔ سارے گاؤں پر بھکمری کا کڑا وقت آپہنچا۔ لوگ طرح طرح کی اٹکل لگا رہے تھے کہ خبر آئی منارام کسی سرکاری کام سے شہر گیا ہوا ہے اور رات کو بھی نہیں لوٹے گا بلکہ دوسرے دن شام

تک لوٹنے کی اُمید ہے۔

خبر سنتے ہی گاؤں والوں کی آنکھوں میں چمک آگئی اور اُن کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے۔ آج رات پہلے کی طرح جنگل پر حکمرانی ہوگی۔ کچھ لوگوں کی آنکھوں سے خوشی کے مارے آنسو بھی نکل پڑے۔

ان بے چاروں کی غمی اور خوشی اسی جنگل سے جڑی ہے۔ کیونکہ وہ صرف جنگل سے ہی روزی حاصل کرنا جانتے ہیں۔ جنگل سے چرائی ہوئی لکڑیوں کو قریبی قصبے کے بازار میں اونے پونے بیچ کر لایا ہوا اناج پکا کھا کر وہ یوں سوچا تے ہیں جیسے واقعی وہ جنگل کے راجہ ہوں۔

اُن کا معمول تھا کہ ایک پہر رات ڈھلنے پہ جنگل کی راہ لیتے۔ پو پھٹنے تک لکڑیاں جمع کرتے۔ جنگل سے ہی لکڑیوں کے گٹھے سروں پر رکھے تیزی سے قصبے کی طرف چل دیتے۔

آج بھی وہ ایک پہر رات گزرنے کے بعد جنگل میں گھس کر لکڑیاں جمع کرنے لگے۔ ان میں مرد، عورتیں، جوان، لڑکیاں سبھی تھے۔ پو پھٹنے سے پہلے وہ جنگلی بیلوں سے لکڑیاں باندھ رہے تھے کہ اچانک منارام یوں نکل آیا جیسے کچھار سے شیر نکل آتا ہے۔ سارے لوگ مارے ڈر کے گاؤں کی طرف دوڑ پڑے۔ منارام کتنوں کو پکڑتا؟ اُس کے ہاتھ صرف مانگی ہی لگی۔

مانگی کے پکڑے جانے پر انہیں زیادہ تشویش نہیں ہوئی۔ کیوں کہ مانگی اکیلی تھی۔ جب وہ چھوٹی تھی، تب ہی اس کے ماں باپ برساتی ندی پار کرتے وقت بہہ گئے تھے۔ مانگی اکیلی رہ گئی تھی۔ گاؤں میں مانگ کر پیٹ بھرتی تھی، اسی لیے نام مانگی پڑ گیا، اور اسے یاد بھی نہیں تھا کہ اس کا نام کیا ہے؟ جب وہ بڑی ہوئی تو جنگل سے لکڑیاں نکالنے لگی۔ اور بیچنے لگی۔

مانگ کر کھانے اور کبھی کبھی بھوکے رہنے کے باوجود وہ بڑی ہوتی چلی گئی، اور اس پر جوانی یوں پھٹ پڑی جیسے کروندے کے درخت پر بہار پھٹ پڑتی ہے، سفید سفید

پھول پورے درخت کو ڈھک لیتے ہیں۔ ہرے ہرے پتّے مسکراتے ہوئے جھومتے نظر آتے ہیں۔ گاؤں میں اُس جیسی جوان اور خوب صورت لڑکی دوسری نہیں ہے۔ اسی لیے پہاڑی دروں سے شراب نکالنے والے بیرو نے اس کو اپنی منگیتر بنا لیا۔ گاؤں والے بھی یہی سمجھتے تھے کہ آنے والی جترا (میلہ) میں بیرو مانگی سے شادی رچا لے گا۔

گاؤں میں آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی کہ مانگی دھر لی گئی ہے۔ کچھ لوگ بیرو کے گھر کی طرف دوڑ گئے کہ اسے خبر کر دیں۔

بیرو کو دروازہ پیٹ پیٹ کر جگایا گیا۔ بیرو جھومتا ہوا باہر آیا۔ کچی شراب کا خمار ابھی ٹوٹا نہیں تھا۔ وہ خمار آلود لہجے میں بڑبڑایا:

"کون سی بپتا آن پڑی تم لوگوں پہ؟"

"مانگی کو منارام گارڈ نے پکڑ لیا ہے۔" لوگوں نے بتایا۔

بیرو ہنسنے لگا۔ اُس کی بے وقت کی ہنسی سب کو بُری لگی۔ مانگی بیرو کی منگیتر ہی نہیں گاؤں کی بیٹی بھی ہے۔ سب خاموش کھڑے رہے۔ بیرو ہنسی ختم کر کے بولا:

"یہ تو ہونا تھا ایک دن۔ وہ رنڈی جنگل میں یوں جاتی ہے جیسے جنگل اس کے یار کا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔

بیرو سے مایوس ہو کر لوگ سوچنے لگے کیا کرنا چاہیے؟ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ چودھری سلام جسے سلامو کہتے، اس کے پاس جانا چاہیے۔ سلامو جنگل سے گوند چرایا کرتا تھا، اور جانوروں کی خرید و فروخت کے ساتھ ساتھ دلالی بھی کرتا تھا۔ کچھ سرکاری درباری کام بھی جانتا تھا۔ گاؤں والے اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے، لیکن کام پڑنے پر اُسی کے پاس جاتے بھی تھے۔ پٹواری اور گارڈ سے سلامو ہی بچایا کرتا تھا۔

کچھ نوجوانوں کا خیال تھا کہ بس لاٹھیاں لے کر منارام پر چڑھائی کر دینا چاہیے۔ لیکن بوڑھے انہیں بندوق کا ڈر بتا کر روک رہے تھے۔

ابھی وہ سلامو اور چڑھائی کے بیچ اُلجھے ہوئے تھے، کسی قسم کا فیصلہ نہیں ہو پا رہا

تھا۔ بات یہی بات چل رہی تھی کہ کیا ہونا چاہیے، اُسی وقت انہیں جنگل سے مانگی آتی دکھائی دی۔ اس کے سر پر بڑا سا گٹھا بھی تھا۔ جب وہ گاؤں میں داخل ہوئی تو سب لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ ایک بوڑھی عورت نے پوچھا:

"کیا بولتا تھا وہ کتا؟"

بڑھیا نے منارام کو کتا کہہ کر اپنی ساری نفرت اگل دی۔

گٹھا پھینک کر مانگی مسکرائی اور بولی:

"ماسی کتا بولتا کہاں ہے وہ تو بھونکتا ہے۔"

نوجوانوں نے مانگی کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ بڑے بوڑھوں نے تجربہ کار آنکھوں سے جائزہ لیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ مانگی محفوظ ہے یا نہیں؟

مانگی نے اس کی سہیلی سانولی کو بلایا۔ لکڑیوں کے دو گٹھے بنائے اور الساتی السائی صبح دونوں گٹھے لیے قصبے کی طرف جانے لگیں۔

راستے میں سانولی نے پوچھا:

"کیا بول رہا تھا وہ منیا کا بچہ؟"

"بول رہا تھا— تیری سہیلی بہت پیاری لگتی ہے اُسے لے آ، پھر جنگل تیرے نام کر دوں گا۔"

مانگی ہنسنے لگی۔ سانولی نے مانگی کی پیٹ پر دھپ جما دیا۔ مانگی چلائی:

"اوئی ماں! اتنا بھاری ہاتھ تو اُس منیا کا بھی نہیں ہے۔"

"اچھا تو مار کھا کر آرہی ہے میری بنّو!" سانولی مسکرا کر بولی

"مارتا کیا؟ میرے آگے اُس کی بندوق بھی دھری رہ گئی۔ پتہ نہیں کیوں جب لوگ بھاگ گئے تو وہ ہنسا اور بولا: تو کیوں نہیں بھاگی؟"

میں بولی:

"بھاگتی کیوں؟ تو کیا سیر ہے جو ڈر جاتی؟"

"تو بندوک سے نہیں ڈرتی؟" منسیا نے حیرت سے کہا۔

میں بولی "بھوک سارے ڈر کھا جاتی ہے۔"

سانولی کسی انہونی بات کی منتظر تھی۔ اُس نے پوچھا:

"پھر کیا ہُوا؟"

"ہُوا کچھ نہیں۔ منسیا نے کہا: مَیں جور جبردستی نہیں کرتا، بس تو آجایا کر، تجھے دیکھ کر کُھس ہو جایا کروں گا۔ پھر جاتے بکھت تو جتنی لکڑی چاہے لے جانا۔" وہ ہنسی پھر بولی "جیسے جنگل اُس کے باپ کا ہے۔"

سانولی نے فکر مند لہجے میں پوچھا:

"تو کیا بولی؟"

"مَیں بولی سانولی کو بھیج دوں گی مجھے چھوڑ دے۔"

وہ شرارت سے ہنسنے لگی تو سانولی نے اس کی چوٹی پکڑ لی۔ مانگی چلّانے لگی:

"اری چھوڑ دے گٹھا گر جائے گا۔"

سانولی نے گھبرا کر چوٹی چھوڑ دی۔ دونوں ہنسنے لگیں۔

اب وہ دونوں قصبے میں داخل ہو رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی دھوپ میں اُن کے چہرے پر پسینے کی بوندیں یوں چمک رہی تھیں جیسے گلاب کی پنکھڑیوں پر شبنم چمکتی ہے۔

لکڑیاں فروخت کرنے کے بعد دونوں جب گاؤں لوٹیں تو دیکھا کہ مانگی کی جھونپڑی کے سامنے بہت سارے لوگ براجمان ہیں۔ چلم اور بیڑی کے دھوئیں کے ساتھ ساتھ باتیں بھی اگل رہے ہیں۔ مانگی کو آتے دیکھ کر گلاموں بولا:

"لے آ گئی تیری جنگل رانی۔"

لوگ بیرو کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔ رانو بولا:

"آج کل تو بھیا منسا رام کی مجا ہے۔ سالے جنگلی سور نے سب سے کھوب صورت ہرنی پکڑ لی ہے۔"

سیا مولولا :

"ہیرا ٹھن لیا ہے میرا۔"

مانگی جھوپڑی میں داخل ہوئی تو ہیرو بھی آگیا۔ اس نے غصے سے کہا :

"کیا بولتا تھا وہ کتا ؟"

"بولتا کیا وہی جو ایک مرد عورت سے بولتا ہے۔" مانگی نے جواب دیا۔

"تو کیوں جاتی ہے اُس سور کی بکھار (جگہ) میں ؟" ہیرو نے زور سے کہا۔

مانگی نے ہیرو کی طرف دیکھا تو یوں لگا جیسے اس کا سارا غصہ بجلی بن کر آنکھوں میں اُتر آیا ہو۔ اُس نے بجلی سی کڑکتی آواز میں کہا :

"تو بول رہا ہے یہ۔ ایدھی ذکمتا، تو جتنی دارو نکالتا ہے آدھی سے جیادہ پی جاتا ہے۔ میرے یہاں آکر ڈکار دکھا، لیتا ہے۔ دو سال سے تیرا میرا پیٹ بھر رہی ہوں۔ اس کی بکھار میں نہ جاؤں تو کیا تیری اوسری (جھوپڑی) میں بھوکی پیاسی پڑی رہوں ؟" پھر وہ اپنے نصیب کو کوسنے لگی۔

"میں جنم سے ابھاگی ہوں۔ ماں باپ کو ندی نگل گئی۔ مانگ مانگ کر پیٹ بھرا۔ جوان ہوئی تو تیرا سہارا لیا۔ اُلٹا تیرا سہارا بن گئی۔ تو لگن (شادی) دو سال سے ٹال رہا ہے۔ گاؤں میں لوگ کیا کیا بات کرتے ہیں! مگر تجھے دارو پینے سے فرصت ملے تب نا تو سوچے۔ تو کبھی ہوش میں رہتا ہی نہیں۔ وہ حرامی سور منسیا بولتا ہے تو روج آجایا کر جاتے وقت بڑا سا گٹھا دے کھود بنا دے گا۔ نہیں تو گاؤں والوں کو ایک تنکا بھی نہیں لینے دوں گا۔"

پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ہیرو شرمندہ تو تھا ہی اور بھی شرمندہ ہوا۔ دو سال سے وہ مانگی پر بوجھ بنا ہوا تھا۔ کھانا، بیڑی کاڑی اور کبھی کبھی شراب بنانے کے لیے گڑ اور نوسادر کے پیسے بھی مانگی سے لیتا تھا۔ لوٹانے کی نوبت کبھی نہیں آتی تھی۔ اُس نے سوچا : مانگی سے جھگڑا مول لینا اچھا نہیں، اور نہ ہی منسارام سے دشمنی۔ وہ چپ چاپ اُٹھا اور باہر آگیا۔ باہر دھوپ

کی کڑکڑاہٹ اور باتوں کی بھن بھناہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

"بھیا ہم تو جانتے ہیں دریا مار کر مگر (مگرمچھ) سے بیر اچھا نہیں ہوتا۔"

"ہاں بھائی بھوکا سیر (شیر) کچھار سے نکل آتا ہے۔ پیٹ بھرا رہے تو پڑا رہتا ہے۔ کیوں بھیا گلامو؟"

رانو بولا:

"دیکھ بیرو! تو بھی سیانا ہے، جیادہ سمجھانے کی جرورت نئی۔ ہم جانتے ہیں کہ منسیا کو کیا چاہیے؟ جب تک ہم جنگل کے سیر کو بھیک (قربانی) نہیں دیں گے، وہ سوئے گا نہیں۔ نہ دیں تو بھوگاؤں پہ کال ٹوٹ پڑے گا۔ ہمارے دھندے بند۔ لوگ بھوکے مریں گے۔ اور یہ اچھا ہوا کہ اس سالے منسیا کا من مانگی پہ ہی اٹکا۔ ارے مورکھا! جب سے یہ منسیا آیا ہے مانگی کے رنگ ڈھنگ بھی بدل گئے ہیں۔ میں نے سانولی کے جاپے سے بات کر لی ہے، آتی جترا میں تیرا لگن پکا سمجھ!"

سیامو نے سب کی طرف دیکھ کر کہا:

"سمجھو وہ اپنے گاؤں کی دیوی بن جائے گی۔ مانگی دیوی۔"

"ہاں بھیا! جو لوگ بلی چڑھتے ہیں وہی دیوی دیوتا بنتے ہیں۔" گلامو نے سیامو کی بات کو ٹیکہ لگایا۔

بیرو لوگوں کے جھنڈ میں سے اٹھا۔ دھیرے دھیرے چلتا ہوا مانگی کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ مانگی یوں بیٹھی تھی جیسے اس کا کوئی عزیز مر گیا ہو۔ بیرو کے آنے اور بیٹھنے تک وہ ہلی نہ ہی نظر اٹھائی۔ بیرو نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا:

"دیکھ مانگی! میرا من تو نا بولتا ہے، پر میں سوچتا ہوں، میں تجھے سکھ دینے تو رہا، الٹا تیرا کھاتا ہوں پیسے کوڑی کے لیے پریشان کرتا ہوں۔ پھر گاؤں والوں کی روجی کا بھی سوال ہے۔ تو نہ گئی تو گاؤں والوں پر اکال پڑے گا۔ سارا گاؤں بھوکا مرے گا۔ میں جلد ہی چار پیسے جوڑ لوں گا۔ پھر ہم اکٹھے رہیں گے بس کچھ دنوں کی بات ہے۔"

غم کے سمندر سے اُبھر کر مانگی ہنس پڑی۔ ہنسی بڑی زہریلی تھی۔ بیرو گھبرا کر

اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی:

"مجھے معلوم تھا بیرو تم چاروں اور بستی والے میری بلی چڑھاؤ گے کیونکہ میرا

کوئی بولنے والا نہیں، کسی سانولی، کالی، گوری اور کسی کی طرف تم آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ

سکتے، کیوں کہ اُن کے باپ بھائی تم کو کاٹ کر رکھ دیں گے۔ میں تو جاؤں گی کیوں کہ میرے لیے میری

جھونپڑی اور منسارام کی جھونپڑی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر میرے جھوٹے سے تمہارا پیٹ بھرتا

ہے تو یہ تمہارا نصیب۔"

اُس کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو چکے تھے لیکن چہرے پر کرب کی لہریں آجا رہی

تھیں۔ بیرو چپ چاپ اُٹھ کر باہر آگیا۔

باہر سرمئی اندھیرا گھروں سے نکلتے دھوئیں سے مل کر گہرا ہو رہا تھا۔ بیرو نے باہر

بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا:

"پہلے کی طرح آج سے پھر جنگل ہمارا ہوگا۔"

لوگ خوشی خوشی اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

چاند ایک گھڑی نکل آیا تو مانگی اٹھی اور جنگل کی طرف چل دی۔

سال بھر گاؤں والوں نے بڑے عیش کیے۔ بندوق کا ڈر تھا نہ کسی چیز کا۔

کبھی کبھار قصبے کی پولس رکتی تھی تو چودھری سلامو اس ٹنٹے کو نپٹا دیتا تھا۔ مانگی کا رنگ

نکھر آیا تھا۔ بڑی بوڑھیاں اُسے یوں دیکھتیں جیسے اندازہ لگا رہی ہوں کونپل پھوٹنے میں

اور کتنا وقت بیتے گا۔

ٹھیک پوس کے مہینے میں، جب جنگل پر بہار آتی ہے، آم کے پیڑوں پر بور

مہکتی ہے، کروندوں کی جھاڑیوں پر سفید سفید پھول ستاروں کی طرح کھل اُٹھتے ہیں،

بلبل اپنی محبوبہ کے لیے مدھر تانیں لگاتا ہے، چڑیاں مست کردینے والی آوازوں میں چہچہاتی

ہیں اور آسمان پر چاند اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ چمکتا ہے، ٹھیک اُسی موسم میں ماتا دیوی

کی جترا بھرتی ہے ۔

پہاڑی پر بنے ماتا دیوی کے مندر کے آس پاس دیو گاؤں اور دُور نزدیک کے دیہاتوں کے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ خرید و فروخت ہوتی ہے، کُشتیوں کے دنگل، سانڈوں کی لڑائی، بَیل گاڑیوں کی ریس، کسرت کے کھیل ہوتے ہیں، وعدے وعید ہوتے ہیں۔ آخری دن بکروں کی قربانی دی جاتی ہے جسے مقامی زبان میں "کر" کہا جاتا ہے۔ اسی دن شادیاں رچائی جاتی ہیں، اس دن شراب پی نہیں جاتی لنڈھائی جاتی ہے ۔

آج وہی دن تھا جس کا انتظار جوان لڑکے اور لڑکیاں کرتے ہیں۔ مانگی سے بیرو نے وعدہ کیا تھا کہ آتی جترا پر وہ اس سے شادی کرے گا۔ وہ بنی سنوری، نئی ساڑی باندھے مندر کے قریب جا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اسے ایک جگہ بیرو نظر آیا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ مانگی اُس طرف بڑھنے لگی۔ اُسی وقت چودھری سلامو نے اسے آواز دی ـــــ چودھری سلامو نہ شراب پیتا تھا نہ پوجا کرتا تھا، پھر بھی وہ جترا کا بڑا آدمی تھا۔ وہ اس موسم میں جانوروں کا خوب دھندہ کرتا تھا ـــــ مانگی سلامو کی آواز پر رُک گئی۔ چودھری سلامو اس کے قریب آیا اور کہا :

"چل میرے ساتھ !"

مانگی سلامو کے ساتھ چلنے لگی۔ دل میں سَو سَو وسوسے اٹھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ مندر کے سامنے پہنچے جہاں کئی جوڑے ہاتھوں میں پھول مالائیں لیے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر کِھلتے پھول کی طرح کومل مسکراہٹ تھی ۔

پنڈت نے مانگی کی طرف دیکھ کر پیشانی پر بل ڈال لیے۔ اُس نے کہا :

" چھی چھی ! اِس ملیچھ کو کہاں لے آئے چودھری ؟ دیوی کا پوِتر استھان اَپوِتر کر دیا۔"

پھر وہ مانگی کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھ کر بولا :

" گاؤں پنچایت نے تمہیں ذات باہر کر دیا ہے مانگی۔ لگن کیسے بنا گر بھوتی (حاملہ

ہونا ملیچھ ہوتا ہے۔ اب تم نہ بستی میں جا سکتی ہو، نہ مندر میں آ سکتی ہو۔"

مانگی نے کہا:

"مگر پنڈت جی! میں تو پنچوں کی مرضی سے یہاں آئی تھی ان کا پیٹ بھرنے، ان کی مرضی سے میں نے اپنی کوکھ میں زہر بو لیا۔ اُن کے پیٹ کا نرک بھرنے کے لیے اپنے آپ کو نرک میں گرا دیا۔ گاؤں والوں نے سال بھر میرا جھوٹا کھایا۔ پھر بھی میں ذات باہر کر دی گئی۔ یہ مجھ پر ظلم ہے پنڈت جی ظلم۔"

سب ساکت ہو گئے۔ پنڈت جی خاموش ہو گئے۔ ایسا لگتا تھا وقت تھم گیا ہے۔

قدموں کی چاپ پر سب چونکے۔ سانولی اور ہیرو ہاتھوں میں مالا لیے چلے آ رہے تھے۔ ہیرو کے پیر لڑکھڑا رہے تھے۔ سانولی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دونوں پر الگ الگ نشہ تھا۔

مانگی تیز تیز چلتے ہوئے اُن کی طرف بڑھ گئی۔ اُسے اپنی طرف آتے دیکھ کر دونوں رک گئے۔ مانگی بولی:

"تو ہی تھا نا ہیرو! مجھے اِس نرک میں جانے کا بولا تھا۔ تو ہی بولا تھا نا دو پیسے جمع کر لوں گا، پھر ہم ساتھ رہیں گے۔ مگر یہ پنڈت بولتا ہے گاؤں پنچایت نے مجھے ذات باہر کر دیا گیا ہے۔ اب میں گاؤں بھی نہیں جا سکتی نہ مندر میں جا سکتی ہوں۔ کیوں ایسا کیا تم لوگوں نے؟"

پھر مانگی نے آگے بڑھ کر ہیرو کا گریبان پکڑ لیا۔ سانولی کے چہرے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔ ہیرو چپ چاپ کھڑا تھا۔ مجرم کی طرح نظریں جھکائے۔ مانگی نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ دو قدم پیچھے ہٹی اور بولی:

"تو کیا بولے گا میرے ٹکڑوں پہ پلنے والے کُتّے! اب دیکھوں گی تجھے تیرے سنگت والوں کو، اس گاؤں پنچایت کو۔"

پھر وہ یوں ہنسی جیسے پاگل ہو گئی ہو۔ لوگ چونک کر اُسے دیکھنے لگے۔ کچھ دیر بعد اس کی ہنسی تھمی تو وہ زور سے بولی:

"کل سے اس جنگل میں ایک اور بندوک بجر آئے گی وہ میری ہو گی۔"

لوگ اسے حیرت اور خوف سے دیکھنے لگے۔۔۔ پھر وہ قہقہے لگاتی ہوئی جنگل کی ہرنی کی طرح جنگل میں دوڑتی چلی گئی۔

●●

۹ جُلوس

"گنیہ" کا اصلی نام عبدالغنی تھا۔ لیکن خود اُسے کوئی عبدالغنی کہہ کر پکارتا تو وہ متوجّہ نہیں ہوتا تھا۔ کیوں کہ اس کے کان گنیہ کی آواز سے مانوس تھے۔

گنیہ کا لباس ہی اس کی کاہلی کی نشان دہی کرتا تھا۔ میلی کچیلی لنگی، جس کی کنار جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی لسر لسیر کرتی ہوئی۔ میلی چکٹ قمیص جس کا دامن لاتعداد چھیدوں سے چھلنی جو کہ بیڑی پینے کی علامت تھا۔ الجھے میلے بال داڑھی بھی اس طرح کی ۔ آنکھیں باریک اور پیلی کیچڑ سے بھری ہوئیں۔

اکثر وہ ننکا کے ساتھ نظر آتا۔ دونوں ہم پیالہ ہم نوالہ تھے۔

ننکا کا نام فقیر محمد تھا۔ لیکن گنیہ کی وہ بھی ننکا مشہور تھا۔ دونوں ایک ہی محلّے میں رہتے تھے، دونوں ہم مزاج، ہم پیشہ یعنی بے روزگاری کو ماننے والے تھے اس لیے دونوں میں گہری دوستی تھی۔ دونوں دن بھر میں دو چار روپیہ کہیں نہ کہیں سے ضرور حاصل کر لیتے تھے اور رام داس کے اڈّے پر جا کر پیتے تھے۔

شراب پینے کے علاوہ ان کا ہر کام موسمی ہوتا تھا۔ جیسے شادیوں کا موسم ہوتا تو وہ محلّے غیر محلّے میں کسی نہ کسی کے یہاں خوب ڈٹ کر کام کرتے۔ اس وجہ سے بہت سارے اچھے بُرے لوگوں سے اُن کے مراسم سلام دعا تک تھے۔

ان کی ساری گزر بسر رزاق کے رزق پر تھی۔ وہ سوچتے ضرورت کیلئے مزدور

کھلوانے کی اور غلامی کرنے کی؟ دونوں مست تھے۔

جب شہر میں وعظ کا موسم ہوتا تو وہ وعظ ضرور سنتے اور کبھی کبھار جمعہ کی نماز میں بھی حاضر ہو جاتے۔

رمضان تو اُن کے لیے برکتوں کا مہینہ ہوتا۔ اس مہینے میں ان کے لیے نعمتوں کے خوان آتے۔ مہینہ بھر وہ عبادت میں مشغول رہتے۔ شراب کا خیال بھی دل میں نہ لاتے۔ اس ایک مہینے میں اچھا کھانا، پھل فروٹ کھا کر پچھلے سال سے چلی آ رہی خراب صحت بنا لیتے۔ رنگ نکھر جاتا۔ روزہ داروں کی دن رات خدمت کرنے اور عبادت میں لگے رہنے کی وجہ سے کافی فطرہ بھی جمع کر لیتے اور کپڑے بھی سل جاتے۔ لنگیاں مل جاتیں اتنی کہ بُرے وقتوں میں وہ بیچ بھی سکتے اور ان کا بُرا وقت تو مسجد سے نکلتے ہی شروع ہو جاتا۔

اُن کے لیے بُرا وقت ہی تھا کہ شہر میں بھن بھناہٹ شروع ہوئی۔ اچانک ہی اُن کے لیے موسم ہرا ہو گیا۔ ایک دن راستے میں سیٹھ جان محمد سے ملاقات ہو گئی۔ علیک سلیک کے بعد سیٹھ صاحب نے کہا:

"بھئی کہاں ہو تم دونوں؟ کام آ پڑا ہے اور تم دونوں غائب۔ چلو آج سے کام پر لگ جاؤ۔ ہری جھنڈیاں بنانی ہیں، سارے محلّے کو سجانا ہے۔ یہاں گیٹ بنانا ہے۔"

سیٹھ جان محمد محلّے کی جلوس کمیٹی کے صدر تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے ہاتھ میں چندے کا کام لے کر باقی تمام کام گنیہ اور ذکا کے حوالے کر دیا۔ دونوں نے دل کھول کر پھرارے، جھنڈیاں اور پھول بنائے۔ چار کی جگہ آٹھ کا خرچہ بتایا۔ لیکن سب سے پہلے سیٹھ جان محمد کا ہی محلّہ سجا۔ اس طرح گنیہ اور ذکا نے کچھ دن کا سہارا کر لیا۔

جس دن جلوس نکلنا تھا، اُس کے ایک دن پہلے دونوں نے خوب محنت کی، رات کو ان کے لیے کام ہی کام تھا۔ گیٹ بنانا، لائٹ لگوانا، اور نگرانی کرنا۔ رات بھر دونوں ہاتھوں میں پکڑنے والی ہری ہری جھنڈیاں بناتے رہے۔ اس دوران دونوں

گلابیے کے دم بھی لگاتے رہے ۔ اور میٹھی میٹھی چائے پیتے رہے ۔

علی الصبح سیٹھ جان محمد آئے تو ان کے پاس بلّے تھے جن پر گنبد کی رنگین تصویریں چمک رہی تھیں۔ ان میں کچھ خاص بلّے بھی تھے ۔ ان میں سے دو بلّے ان کو بخشے ۔ اور اسی مناسبت سے خاص جھنڈے بھی۔ ملائم ریشم کے جھنڈے پر سنہرا کام کیا ہوا تھا۔ "اللہ اکبر" اور کلمۂ طیبہ لکھے ہوئے تھے۔

دونوں نے اسی وقت بلّے جیب پر لگائے اور بچوں میں جھنڈیاں تقسیم کر کے چھوٹا سا جلوس بھی محلّے میں نکال دیا۔ تھوڑی دیر میں محلّے کے سب لوگ جمع ہو گئے تو جان محمد آئے اور بڑے جلوس میں شامل ہونے کے لیے محلّے کے جلوس کی قیادت کرنے لگے۔

جب محلّے کا چھوٹا جلوس بڑے جلوس میں شامل ہوا تو جیسے گم ہو گیا۔ انسانوں کا سمندر تھا کہ لہریں مار رہا تھا۔ حدِ نگاہ تک سر ہی سر۔ جب نعرۂ تکبیر بلند ہوتا تو فلک تک شگاف سا پڑ جاتا۔ زمین تھرانے لگتی۔ مارے جوش کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے۔ جلوس جب گشت پر نکلا تو میلوں تک بڑا معلوم ہوا۔ جلوس چل نہیں رہا تھا، رینگ رہا تھا۔

گنیہ اور نکا دونوں ساتھ تھے۔ دونوں نعرے لگا رہے تھے۔ جلوس جس سمت بڑھ رہا تھا، اسی سڑک پر آگے اندر کی طرف رام داس کا اڈّہ تھا۔ ان کے اندر خواہش جاگی کہ دو چار گھونٹ تو آج کے خوشی کے موقع پر ہو ہی جانا چاہیے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو سیٹھ جان محمد کا مسرور چہرہ نظر آیا۔ دونوں جھٹ ان کے برابر آ گئے۔ سیٹھ نے کہا:

"آواز نہیں نکل رہی ہے۔ ابے ذرا زور سے نعرہ لگاؤ۔"

گنیہ جو کہ ذرا منہ پھٹ تھا، فوراً بولا:

"رات بھر تو کام میں لگے رہے، صبح ہوتے ہی جلوس میں جٹ گئے۔ کچھ کھایا نہ پیا۔"

سیٹھ جان محمد جلوس کی لمبائی چوڑائی سے مسرور تھے اور ان دونوں نے بھی خوب محنت کی تھی، اس لیے مسکراتے ہوئے فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور دو ہری ہری پتیاں کھینچ

لیں اور گنیہ کی طرف بڑھا دیا۔ گنیہ اس وقت نعرہ لگانے میں مصروف تھا اس لیے وہ دونوں نکا نے جھپٹ لیے۔

اب دونوں سیٹھ جان محمد کے پیچھے ہو کر رُک گئے۔ پہلے انہوں نے اپنے بلّے نکال کر قریب چلتے ہوئے بچوں کو دے دیے۔ بلّے لینے کے بعد بچوں کی نظریں اُن کے پھڑپھڑاتے چمکتے جھنڈوں پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ اس طرح چل رہے تھے کہ جلوس دس قدم چلتا تو وہ چار قدم۔ جب بھیڑ نسبتاً کم ہوئی تو گنیہ نے کہا:

"جھنڈیوں کا کیا کریں؟"

گنیہ نے کہا:

"نعوذ باللہ! اڈے پر لے جاؤ گے، حضور سرورِ عالم کا پاک نام۔ اور ناپاک جگہ پر — یہ مجھ سے نہ ہو گا۔" نکا نے پوچھا: "پھر.....؟"

تب تک جلوس گزر چکا تھا، چند بچے پیچھے رہ گئے تھے، اور اب وہ لوگ رام داس کے اڈّے کے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ گنیہ نے فوراً اپنا جھنڈا ایک بچّے کو تھما دیا۔ دوسرے نے للچائی ہوئی نظروں سے نکا کی طرف دیکھا تو اس نے کہا:

"لے تو بھی لے لے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا جھنڈا دے دیا۔

جھنڈے اور بلّے دے کر وہ ایسا محسوس کر رہے تھے جیسے بندھوا مزدوری سے چھوٹے ہوں۔ دونوں نے دیکھا — جلوس کافی دُور چلا گیا تھا۔ نعرے اور جھنڈوں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ جوں ہی رام داس کی گلی کا نکڑ آیا وہ دونوں شڑاپ سے اندر گھس گئے۔

••

۱۰ روشن شہر کی سیاہ کہانی

آسمان مسلسل روئے جارہا تھا۔

کالے کالے آنسو زمین کی طرف رواں تھے۔ ان کالے کالے آنسوؤں کی وجہ سے ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ زمین پر رقیق مادہ بہہ رہا تھا۔ اس میں انسانوں کا خون بھی شامل تھا۔ یہ مادہ گڈھوں، گڑھوں میں جمع ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی بجلی چمکتی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کہیں دھماکہ ہوا ہے۔ لمحہ بھر کی چمک میں لوگ دیکھ لیتے کہ کوئی بھیانک عفریت سرتا پیر سیاہ لباس میں ملبوس ہے۔ اور اس کے ہاتھ میں خنجر ہے جو بجلی کی روشنی میں چمک جاتا۔ (یہ بھیانک عفریت ان کے اعصاب پر حاوی تھا۔)

بجلی چمکنے کے بعد بھیانک سناٹا چھا جاتا۔ اندھیرے میں سناٹے کا احساس شدید تر ہو گیا تھا۔ کہیں پر کوئی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان کے کالے کالے آنسوؤں نے اندھیرا پھیلا کر سارے شہر کی زبان کو سُن کر دیا ہو۔

آسمان کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ ان آنسوؤں میں جتنی گندگی تھی، وہ تمام شہر میں جمع ہو گئی تھی اور اس سے تعفن پھیل رہا تھا۔ یہ تعفن ہر جگہ تھا۔ چھتوں پر، سڑکوں پر، گلیوں میں، بازاروں میں۔

اس بھیانک اندھیرے میں تعفن کو ہٹانے والوں کا نام و نشان نہ تھا۔ کوئی آتا بھی کیونکر جب کہ اپنے ہی دروازے سے باہر قدم رکھنا موت کو گلے لگانا تھا۔ اگر باہمت

آدمی دو قدم ہی باہر نکالتا تو چمک دار خنجر اس کا سارا لہو اس تعفن میں شامل کر دیتا۔
سبھی جانتے تھے کہ ان کالے آنسوؤں کے بیچ ایک چمکدار خنجر بھی ہے جو گشت کرتا ہے اور لہو کا پیاسا ہے۔ اس خنجر کو اسی روز کے لیے سان پر چڑھایا گیا تھا۔ اس کی نوک ایسی تھی کہ نشانے پر بیٹھتی تھی۔ اور اس کی دھار کا جواب ہی نہ تھا۔ جب چاہو کاٹ لو، جیسے چاہو ٹکڑے کر دو۔

گھروں میں دبکے بیٹھے لوگ تو برستے ہوئے آنسوؤں کے بارے میں بھی نہیں جانتے تھے کہ کہاں سے آ رہے ہیں۔ لیکن اوپر سے آ رہے تھے، اس لیے انھوں نے آسمان سے برسنے کا نام دے دیا۔ لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ خنجر کہاں سے آ ٹپکا۔ ایک دوسرے سرگوشیوں میں پوچھتے:

"وہ خنجر کہاں سے آیا؟"

"معلوم نہیں!" جواب ملتا۔

ایک سرگوشی سرسرائی:

"میں نے دیکھا۔ اس خنجر کو شہر میں لانے والا آدمی سر تا پیر سیاہ لباس میں ملبوس ہے۔ اور اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ وہ صرف آواز پر نشانہ لگاتا ہے۔ وہ جنونی ہے، اس کے اندر ابلیس کی روح حلول کر گئی ہے۔ اور سنا ہے اُس کے ساتھ رتھوں والے اور تاج و تخت والے بھی ہیں۔"

سرگوشیاں دروازے سے باہر نہیں نکل سکتی تھیں، کیوں کہ دروازے بند تھے۔ سرگوشیاں کرنے والوں کو خدشہ تھا کہ باہر نکلتے ہی وہ چمکتا خنجر اُن کی طرف لپکے گا۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ کالے آنسو برسانے والا بھی وہی جنونی ہے۔ اس جنونی کے تابع بہت ساری روحیں ہیں، جو یہ کالے کالے آنسو زمین پر برسا رہی ہیں، اور یہ آنسو جس کسی پر گرتا ہے وہ بے جان ہو جاتا ہے۔

مسلسل اندھیرا ہونے کی وجہ سے رات اور دن کا فرق مٹ چکا تھا۔ آنسو

مسلسل برس رہے تھے۔ لوگوں کی تعداد کم ہو رہی تھی۔ تعفّن اتنا بڑھ چکا تھا کہ سانس لینا دو بھر ہو گیا تھا۔ اس تعفّن کو اور برستے ہوئے آنسوؤں کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔ جو ذی روح گھروں میں بند تھے، وہ اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھ رہے تھے، کیوں کہ کالے آنسو اور وہ خنجر روزنوں سے بھی جھانک کر اپنے شکار کو تاک لیا کرتے تھے۔ کونے کھدروں میں دبکے ہوئے دو چار لوگوں میں سے کسی نہ کسی پر وار چل ہی جاتا تھا۔ اور ذی روح تڑپ تڑپ کر اپنی جان دے دیتا۔ دوسرے دور ہٹ کر دم سادھے تھر تھر کانپتے، اس کو دیکھتے رہ جاتے۔ کسی سے فریاد بھی نہیں کر سکتے تھے کہ گھر میں ہی غیر محفوظ تھے، اور انہیں اس کا علم بھی تھا کہ حاکمِ شہر اور منصفِ شہر خود اس کالی اندھی طاقتوں کے زیرِ اثر ہے۔

اسی حالت میں کتنے دن بیت گئے۔ اب تو شہر کے لوگ اندھیرے کے کالے آنسوؤں، خنجر اور تعفّن کے عادی ہوتے جا رہے تھے کہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں آواز گونجی:

" حاکمِ شہر کی طرف سے اعلان کیا جاتا ہے کہ تمام لوگ اپنے اپنے کاموں میں جٹ جائیں "!

لوگوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ آواز حاکمِ شہر کی طرف سے تھی۔ کیوں کہ وہ یہ بھول گئے تھے کہ کوئی حاکمِ شہر بھی ہے۔

کچھ لوگوں نے ڈرتے ڈرتے دروازے کھولے تو تعفّن نے انہیں پیچھے ڈھکیل دیا۔ لیکن مسلسل مقید رہنے کے بعد وہ تعفّن کو برداشت کرتے ہوئے باہر نکلے تو انہیں پتہ چلا کہ جس اندھیرے کو وہ رات کا اندھیرا سمجھ رہے تھے، وہ دن کا گہرا اندھیرا تھا۔ بند گھروں میں پھیلا اندھیرا۔ باہر تو اُجالا ہو چکا تھا۔ کچھ لوگ سڑکوں پر نکل آئے، کچھ لوگ اپنے رشتے داروں کی خیریت پوچھنے چلے گئے۔

تبھی انہوں نے دیکھا کہ بہت سارے محلّے غائب ہیں، مکانوں کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ سب خاک ہو گئے تھے۔ جگہ جگہ خون کے پرانے اور تازہ دھبّے تھے۔ سارا شہر دھواں دھار ہو گیا تھا۔ دھواں، تعفّن، بارود کی بو، خوف کا احساس یہ سب مل کر ان زندہ

انسانوں کو موت کے منہ میں جلتا ہوا بنا رہے تھے۔

لوگوں کو ابھی باہر آئے ہوئے چند لمحے ہی بیتے تھے، وہ بربادیٔ شہر کا منظر ٹھیک طرح دیکھ بھی نہیں پائے تھے کہ ایک جانب سے بھن بھناہٹ اٹھی، پھر یہ بھن بھناہٹ چیخ و پکار میں تبدیل ہوئی۔ پھر وہی کالے آنسو برسنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس جگہ چیخ و پکار ہو رہی تھی وہاں بھی کالے آنسو برس رہے تھے اور جس طرف لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے، کالے آنسو ان لوگوں کی زندگیاں چاٹ رہے تھے۔

جس کا منہ جس طرف تھا وہ اسی طرف دوڑا۔ ایک تو کالے آنسو برس رہے تھے، دوسرا وہ خنجر تھا، تاک تاک کر وار کر رہا تھا۔

کچھ دیر تک خوف ناک دھماکوں کی آوازیں آتی رہیں، پھر سناٹا چھا گیا۔ کب رات ہوئی؟ کب دن نکلا؟ کسی کو پتہ نہ چلا۔ انہیں نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا۔ ان کے جسم لاغر ہو گئے تھے۔ بعض سوکھ کر کانٹا بن گئے تھے۔ خوف و دہشت کی وجہ سے وہ ہر وقت پسینے میں بھیگے رہتے۔ ان کے بدن سے چپکی پسینے کی چپ چپاہٹ رستی جس سے بدبو پھیلتی اور تعفن میں شامل ہو جاتی۔ کوئی کسی سے کچھ بولتا نہ کسی کی سنتا تھا، جن کے گھروں کو آگ کھا رہی تھی وہ مرنے کا انتظار کر رہے تھے۔

انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ روزِ حساب آ گیا ہے اور اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہو گئے ہیں۔ ہر طرف عذاب کے فرشتے بکھر چکے ہیں اور انہیں تلاش کر رہے ہیں۔ ہر ایک کو یہی محسوس ہوتا کہ اب اس کی باری ہے۔ کبھی کوئی بم کا دھماکہ ہوتا تو وہ سمجھتے کہ بس اب چند لمحوں میں ان کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اچانک بھونپو پکار اٹھا تو لوگوں نے سمجھا کہ کوئی نیا صورِ عذاب ہے۔ لوگ اپنی اپنی جگہ گر پڑے اور بھونپو کی طرف دھیان لگا دیا۔ آواز آئی:

"آج شہر میں حاکموں کا حاکم آنے والا ہے۔ اس لیے امن و امان ہو گیا ہے، تمام لوگ اپنے اپنے کاروبار میں دھیان لگائیں۔ کیا ہوا تھا بھول جائیں۔"

یہاں کے لوگوں کو بھول جانے کی پرانی عادت تھی ہی۔ جب وہ ایک روزِ حساب

بھول جاتے تو دوسرا روزِ حساب اُن پر نازل کر دیا جاتا۔ سو برس سے روزِ عذاب یہاں نازل

ہو رہا تھا، اور اس کا کوئی وقت مقررہ نہیں تھا۔

لوگ کھوئے کھوئے سے باہر نکلے اور اپنے اپنے کاروباری ٹھکانوں کی بربادی

دیکھ کر افسوس میں غرق ہو گئے۔

کون حاکموں کا حاکم آیا اور کب گیا انہیں اس کی خبر تک نہیں ہوئی ۔۔۔ لیکن

انہوں نے اتنا ضرور سُنا کہ کالے کالے آنسو برسانے والوں کو ہٹا دیا ہے اور اندھی کالی

طاقت کے مالک کو اس کے حواریوں نے کہیں چھپا لیا ہے۔

جس نے بھی حاکمِ اعلیٰ کو دیکھا تو اس نے اندازہ لگایا کہ حاکمِ اعلیٰ بھی مجبور

ہے، کیوں کہ اسے بھی اندھی کالی طاقت کے حواریوں نے زیرِ اثر کر لیا ہے۔ اور وہ اسے،

تعفّن کے ڈھیروں، جلتے محلّوں، برباد بستیوں سے بچا کر کشادہ سڑکوں، پارکوں کی جانب

لے گئے۔ تعفّن کے ڈھیر اور جلتے مکان حاکمِ اعلیٰ کے انتظار میں مسلسل بڑھتے گئے۔

حاکمِ اعلیٰ جونہی اپنے سنگھاسن کی جانب بڑھا، چمکدار خنجر پھر آزاد ہو گیا۔

اب کالے آنسو نہیں برس رہے تھے، لیکن وہ کالی موٹھ والا خنجر زندگیاں چاٹ رہا تھا۔ اندھیرا

ہی اندھیرا محسوس ہو رہا تھا۔ دھواں ابھی تک اُٹھ رہا تھا۔ فضا مکدّر تھی۔ ہر ایک کے سر پر وہ

پیاسا خنجر لٹک رہا تھا۔ سارا شہر قبرستان بن چکا تھا۔ زندوں کا قبرستان۔ صرف ایک

کھڑکی سے ہلکی ہلکی روشنی چھن کر آ رہی تھی۔ لوگ اس کھڑکی کے پورے کھلنے کا انتظار کر رہے

تھے۔ (کیا وہاں کے لوگ نہیں جانتے کہ کوئی بھی کھڑکی کھولی جاتی ہے، کھُل نہیں جاتی۔)

اور اس کھڑکی کی روشنی کو دیکھ کر اُن میں زندہ رہنے کا حوصلہ بیدار ہو رہا تھا۔

●●

۱۱

ایک گھر

گھر کی چار دیواری ہے، لیکن وہ چار دیواری کہلائی بھی جا سکتی ہے اور نہیں بھی کہلائی جا سکتی۔ کیوں کہ یہ چار دیواری یا نگمرے کی پتلی پتلی کاٹی ہوئی پٹریوں سے بنائی گئی ہے۔ یہ چار دیواری ہے ایسی ہے کہ سانس بھی لو تو باہر اور آزو بازو معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی نے سانس لی ہے۔

اس گھر کی بناوٹ ایسی ہے کہ یہاں سردیوں میں سردی، گرمیوں میں گرمی اور برسات میں ہلکی ہلکی پھوار کے مزے لیے جا سکتے ہیں۔ اس گھر کو یا اس جیسے کروڑوں گھروں کو گھر ہی کہیں گے، بلکہ ہم انہیں ایر کنڈیشن بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ اس قسم کے گھروں میں ہر موسم سے نبرد آزما اور لطف اندوز ہونے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔

یہ بھی ایسا ہی ایک گھر ہے۔ اس کی بھی چار دیواری ہے۔ اور اس میں بھی ایک خاندان آباد ہے۔ مسائل ہیں، لڑائی جھگڑا، ہمدردی اور محبت، تنگ دستی اور خوش حالی، بیماری اور تندرستی، خوشی اور غمی سب کچھ ہے جو ایک عالی شان پختہ بلڈنگ میں بھی ہوتا ہے۔ اس لیے یہ گھر بھی گھر کہلانے کا مستحق ہے اور اسے بھی گھر کا درجہ حاصل ہے اور ہمارے یہاں اس قسم کے گھروں کی بہتات ہے۔

ماں اس گھر کی سربراہ بن گئی ہے۔ کیوں کہ باپ کا سایہ اٹھ گیا ہے۔ ماں جب سے اس گھر میں آئی ہے تب سے وہ اس چار دیواری کو پختہ کرنے کے خواب بنتے بنتے اس کے

ڈھل گئے چھوڑ چکی ہے۔ زمانے کے غموں کو ڈھوتے ڈھوتے اس کی کمر خمیدہ ہو چکی ہے، اس کی کمزور چمڑی نے اس کی وریدوں، شریانوں اور نسوں کو ابھار دیا ہے۔ وہ رات بھر کھانستی رہتی ہے۔ اس کی کھانسی احتجاج بھی ہے اور اعلان بھی کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ اس کا ڈھانچہ دو مٹھی بھر کا رہ گیا ہے۔ اس لیے کچھ دیر کے لیے اس کی کھانسی رُک جاتی ہے تو۔ بیٹی آنکھیں کھول کر دیکھتی ہے کہ ماں کہیں سرد تو نہیں ہو گئی۔ جب اسے اطمینان ہو جاتا ہے، کہ ابھی سر پر بوڑھی ماں کا سایہ موجود ہے تو وہ اپنی آنکھیں موند لیتی ہے اور جب ماں کی مہین کھوں کھوں اس کے کانوں سے ٹکراتی ہے تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے کہ ماں کے جسم میں ابھی اتنی قوت باقی ہے کہ وہ کھانس سکتی ہے اور زندہ رہ سکتی ہے۔

ماں کی کُل کائنات دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ وہ اس تکون میں پھنسی ہوئی ہے اور اس تکون کا سب سے مضبوط ستون جو اس نے تھاما ہے، وہ بیٹی ہے، کیوں کہ اس تکون میں بیٹی اس کی طرح بے سہارا ہے۔ بڑا اور چھوٹا تو کسی نہ کسی ستون سے ٹیک لگا ہی لیں گے مگر بے ستونی بیٹی کے حصے میں آئے گی۔ اِس لیے اس نے بیٹی کو اپنا کمزور ستون سونپ دیا ہے۔ جتنے دن وہ سانس لیتی رہے گی اتنے دِن تک تو بیٹی پر نظر رکھے گی۔

ماں کو بڑے اور چھوٹے پر بھروسہ نہیں ہے کہ وہ بہن کا سہارا بنیں گے، بڑا تو کب کا ماں کے جیسی حالت کو پہنچ چکا ہے۔ اس نے عورت سمیت کئی بیماریاں پال رکھی ہیں۔ جو اندرونی بھی ہیں اور بیرونی بھی۔

بڑے کی شادی ہوتے ہی اس کا رشتہ بیوی سے اتنا مضبوط ہو گیا ہے کہ اس نے ماں، بہن اور بھائی کے رشتے کو اس چار دیواری کے بیچ کھوکھوں کے تختوں کی ایک دیوار کھڑی کر کے کاٹ دیا ہے، اپنی ساری خوشیاں سمیٹ کر بیوی کے قدموں میں ڈال دی ہیں۔

بیوی بھی ایسی ملی ہے کہ اس نے خوشیوں کے ساتھ ساتھ ماں کے اس بیٹے اور بہن کے اس بھائی کو بھی پیروں تلے داب لیا ہے۔ اس کی زبان سے ہمیشہ الوزلیشن کی طرح احتجاج ہوتا رہتا ہے۔ اس کے نعرے گالیوں کی آواز میں فضا کو گھیر لیتے ہیں۔ صبح ہوتی ہے تو اس کے

مغلّظ نعرے کئی پارٹیشنوں کو چیر کر دوسروں کے گھروں میں گھسنے لگتے ہیں اور اپنی زد میں آئے ہوئے لوگوں کو جاگ اُٹھنے کی دعوت دیتے ہیں۔

اس کا شوہر، ماں کا وہ بیٹا جس نے ماں، بہن، بھائی کے پیار کو کاٹ دیا ہے پہلے سے ہی ان تعفّن بھرے نعروں کو سننے کے لیے جاگا ہوا ہوتا ہے اور خاموش پڑا پڑا استعار رہتا ہے، کیوں کہ وہ حالات سے نبرد آزما ہو کر نڈھال ہو چکا ہے، تھک چکا ہے۔

رات میں جب اس کی بیوی اپنی زبان سے الفاظ کاٹنے کا کام کرتی ہے تو وہ ماں کی کھوں کھوں بند ہوتے ہی اپنی کھوں کھوں میں کھو جاتا ہے۔ بیوی کیا بول رہی ہے وہ سنتا بھی نہیں اور اسے اس کی پرواہ بھی نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ میں مگن ہے۔

وہ بھی ماں کی طرح آس چھوڑ چکا ہے۔ بس دم بہ دم آتے جاتے دم کے سہارے زندہ ہے، پتہ نہیں کس دم بدن سے یہ دم نکل جائے۔ لیکن ابھی اپنی سانسوں کو درست کرتے ہوئے زندگی کے کڑے کوسوں کو جھیل رہا ہے۔

کبھی وہ بڑی حسرت سے اپنی ماں اور بہن اور بھائی کو دیکھتا ہے۔ محرومی کا احساس اور بڑھ جاتا ہے تو وہ چلم کے لمبے لمبے کش لگا کر رات کے اندھیرے اور اپنی محرومی سے سمجھوتہ کر کے سو جاتا ہے۔

بہن نوجوان ہے۔ اُس نے زندگی کی بہت کم بہاریں دیکھی ہیں۔ لیکن اس کے لیے طویل دورِ خزاں شروع ہو چکا ہے۔ اس کی جوانی کو کب کا گھن لگ چکا ہے۔ ماں اور بھائی نے سوجھبوجھ کے ساتھ اس کے ہاتھ پیلے کیے تھے۔ خوش تھے کہ اپنے فرض کو پورا کیا ہے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ اپنے فرض کی آڑ میں انہوں نے اس خوب صورت نوجوان زندگی کو مقامِ برزخ سے نکال کر جہنّم میں پہنچا دیا تھا۔ اور جب وہ اُس جہنّم سے نکلی تو اکیلی نہیں تھی، ایک وجود اس سے چمٹ آیا تھا۔ اس کی کوکھ سے ایک کونپل پھوٹ رہی تھی جسے وہ اپنے آپ کے ساتھ سینچ رہی تھی۔

وہ کبھی اپنے بچّے کو دیکھ کر غمگین ہوتی، کبھی اُجلی چاندنی کی طرح ہنس پڑتی۔

جب وہ غم گین ہوتی تھی تو اس کی غلافی آنکھیں سوچ میں ڈوب جاتی تھیں اور فکر کے گھیرے سائے
اس کے کتابی چہرے کو گھیر لیتے تھے، تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے چاند کو بادلوں نے چھپا لیا ہو اور
جب وہ تمام الجھیڑوں سے آزاد ہو کر مسکراتی تھی تو کرنیں سی پھوٹ نکلتی تھیں۔ اس کا عزم
اور حوصلہ اسے سوچ و فکر کے بادلوں اور گھٹاؤں کے گھیرے سے نکال لاتا تھا۔

اس کا چھریرا بدن، کتابی چہرہ اور غلافی آنکھیں ہر کسی کو اپنی طرف کر لیتے لیکن
وہ اپنی فکرِ بے کراں میں خود ہی ہچکولے کھاتی رہتی۔ اُسے اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ کچھ
لوگ ساحل سے نظارہ کر رہے ہیں۔

وہ مردم بیزار، اپنی ماں سے آس جوڑے بھائی سے آس چھوڑے، ننھی سی جان
سے ہزاروں اُمیدیں باندھے زندگی کی اونچی نیچی چوٹیاں عبور کر رہی ہے۔ اس کی خواہشوں اور
تمناؤں کے سمندر میں لہروں کا نام و نشان نہیں ہے۔ سپاٹ بن چٹیل میدان کی طرح پھیلا ہوا ہے
وہ ہمیشہ خاموش رہتی ہے۔ ایسی خاموش کہ ٹھہرے پانی کا گمان ہوتا ہے جہاں کوئی لہر اور
تلاطم نہیں ہوتا۔

وہ کبھی اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتی ہے تو اپنے اندر کمی کو کھوجتی ہے۔ سوچتی ہے
کہ مجھ میں کیا کمی ہے۔ کبھی اپنے بھائی کی پتلون اور بشرٹ پہن کر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتی
ہے اور اپنے آپ میں شرما جاتی ہے۔ اس لباس میں وہ نوخیز لڑکا دکھائی دیتی ہے، جس کے
ہاتھ پیر تو لمبے ہو گئے ہیں، لیکن چہرے پر ابھی داڑھی مونچھوں کا اضافہ نہیں ہوا ہے۔ کچھ دیر وہ
خدا سے احتجاج کرتی کہ کاش اسے اسی لباس میں اتارا ہوتا! پھر وہ اپنا سراپا دیکھ کر خود ہی
مسکرا پڑتی ہے اور اپنے آپ پر عاشقانہ نظریں ڈال کر مگن ہو جاتی ہے۔

اس کا نوجوان چھوٹا بھائی ابھی تک ماں کے ساتھ اور اس کے ساتھ ٹکا ہوا ہے،
کبھی وہ بھائی کے لیے فکر مند ہو جاتی ہے۔ سوچتی ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ بھی طوطا چشمی
بتا کر پھر سے اڑ جائے گا۔ اپنی بیوی کے ساتھ! اس کا دل اسی سوچ پر ڈوب ڈوب جاتا ہے۔
چھوٹے نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے؟ سمجھا ہی کیا ہے؟ زندگی کی رسی کو پکڑ کر کھینچنے کی کوشش

کوشش کر رہا ہے۔ زندگی کی رسّی کا ایک سرا تو اس کے ہاتھ میں ہے مگر پھسل پھسل جاتا ہے جیسے خوشیاں پھسل پھسل جاتی ہیں۔ صبح سے شام تک یا در لوم کی گڑگڑاہٹ میں اپنے آپ کو ڈبائے رہتا ہے۔ کبھی رات کی شفٹ میں رات بھر آنکھیں پھوڑتا ہے۔

ماں نے جب دیکھا کہ اس گھر کا یہ آخری سہارا گھر سے بھاگ کر اپنے جوان ہونے کا اعلان کر رہا ہے تو اس کو شادی کی فکر ہوئی۔ پاؤں میں بیڑی پڑے گی تو بھیونڈی بمبئی بھول جائے گا۔ وہ کچھ یہ چکّر ہو آیا ہے۔

اس لیے ماں نے بول چال کر ایک سیدھی سادی بھولے چکّی والی لڑکی سے اسے جوڑ دیا ہے۔ اب وہ بھی کولھو کا بیل بن گیا ہے۔ گھر سے کارخانہ، کارخانے سے گھر، اس کی دوڑ اتنی ہی رہ گئی ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آس کے ڈورے تیرتے رہتے ہیں۔ ماں اور بڑے بھائی کی طرح اس نے ابھی آس نہیں چھوڑی۔ جم کر کام کرتا ہے، کچھ کر گزرنے کی باتیں کرتا ہے اور یاں بہن کو بتاتا ہے۔ دراصل وہ اپنی بیوی کو سنانا چاہتا ہے۔ لیکن اس گھر کے علاوہ وہ بیوی کو کہیں نہیں لے جا سکتا۔ اس لیے ماں اور بہن کے ساتھ باتیں کر کے بیوی کو بھی سنا دیتا ہے۔ سوچتا ہے کہ بیوی کو کہیں لے جاؤں۔ اکیلے میں ۔ لیکن جس بستی میں وہ رہتا ہے وہاں بیوی کے ساتھ گھومنے جانے کا رواج نہیں ہے۔ کبھی کبھی وہ فلم دیکھ لیتا ہے۔ بیوی کو لے جانے کا سوچتا ہے، مگر بیوی اسی مٹی سے بنی ہے۔ اس لیے انکار کر دیتی ہے۔

بہن کبھی کبھی خاموشی سے فلم دیکھنے جاتی ہے۔ اس کا علم انہیں عورتوں کو ہوتا ہے جو اس کے ساتھ فلم میں جاتی ہیں۔ لیکن وہ اتنی معصوم ہے کہ کوئی کبھی نہیں بائے گا کہ اس نے کبھی فلم دیکھی ہو۔ اس کی نظریں ہمیشہ نیچی رہتی ہیں۔ ماں اس پر کڑی نظر رکھتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے ادھر ادھر ہو جاتی ہے، تو ماں بے چین ہو جاتی ہے۔ گھر چھوٹا ہونے کے باوجود اس کے باہر نکلتے ہی سونا سونا سا لگتا ہے۔ اس گھر میں اس کی خوشبو رچی بسی ہے۔ وہ اس گھر سے باہر گئی بھی کب؟ چند ہی لمحوں کے لیے گئی تو ایک کونپل بھی ساتھ لے آئی، جس کی چھاؤں ابھی سے محسوس کرتی اور جیتی چلی جاتی ہے۔

اُس کے من میں کسی شہزادے کا ہیولا سا ضرور ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ وہ شہزادہ آئے اور اُسے اٹھا کر لے جائے۔ پتہ نہیں وہ شہزادہ آئے گا بھی۔ اسے اٹھا لے جائے گا بھی۔ لیکن اُسے اُمید ہے کہ ایک نہ ایک دن اُس کی مُراد بر آئے گی اور اس کے من میں بسا شہزادہ ضرور آئے گا۔

ایک بار اس نے خواب دیکھا جو اپنی ماں کو بیان کر رہی تھی۔ دھیمے دھیمے کبھی مسکراتی تھی کبھی غم گین ہو جاتی تھی۔ ماں بیٹی دونوں مختصر صحن میں بیٹھی تھیں۔

"نیند کچی پکی تھی۔ ایسا معلوم ہُوا بلب جل اٹھا۔ میں اٹھی ــــ میں اٹھی تو دیکھتی ہوں کہ ہیرے جواہرات کی جڑاؤ کرسی پر ایک شہزادہ بیٹھا ہے" اور مجھے بلا رہا ہے" میں اُٹھ کر اس کی طرف بڑھی تو اس نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا.... پھر...... " وہ مسکراتی ہے ــ "پھر ہم دونوں پتہ نہیں کس سمت چل نکلے ــــ بڑی خوشبو تھی۔ پتہ نہیں اس کے بدن سے یا میرے بدن سے پھوٹ رہی تھی۔ پھر وہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔" وہ غم گین ہو جاتی ہے۔ "صرف شہزادے کی آواز آتی ہے۔ تم لوٹ جاؤ، تم لوٹ جاؤ۔ میں نے شہزادے سے کہا: یہ ناممکن ہے ــ اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔"

ماں خاموش اپنی بے نور آنکھوں سے اس کی طرف دیکھے جا رہی ہے اور وہ گھر میں بیٹھی اپنی چھوٹی بھاوج کو دیکھ رہی ہے۔ سوچ رہی ہے یہ گھر تو بھاوج کا ہے۔ میرا گھر کہاں ہے؟ مجھے بھی آج نہیں تو کل ایک گھر کی ضرورت پڑے گی۔

اس کی آنکھوں میں برف سی گھلتی ہے۔ بوند بوند پانی ٹپکنے لگتا ہے ــ ماں کی کھوں کھوں بڑھ جاتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے گھر میں غموں کی ہوا گھس پڑتی ہے۔

••

اندھیرا برف کی طرح جما ہوا تھا، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا، جیسے دنیا اندھی ہو گئی تھی، اپنا وجود اپنے اندر ہی سمٹا ہوا تھا۔ ہر وجود اندھیرے کی دبیز چادر میں چھپ گیا تھا۔ کوئی بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جب کوئی دکھائی نہ دے اور اپنے وجود کی گواہی دینے والا کوئی نہ ہو تو اپنا وجود بھی عدم وجود میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

عجیب سے غیر امکانی حالات تھے۔ زمین اندھیرے سے کالی تھی، اوپر آسمان سُرخ تھا۔ کالے اور سُرخ رنگ کا کوئی میل نہیں۔ کالا رنگ ہر رنگ کو کھا جاتا ہے۔ کالے رنگ میں کوئی بھی رنگ ڈالو کالا رنگ اس کو جذب کر لیتا ہے۔ کالے رنگ سے مل کر ہر رنگ اپنا وجود کھو دیتا ہے۔

سُرخ رنگ، زمین کی طرف گرتا ہوا محسوس ضرور ہوتا تھا لیکن تھوڑی دور تک سفر کرنے کے بعد وہ بھی اپنی سرخی کھو دیتا تھا۔

سُرخ رنگ کی چادر صرف آسمان ہی تک محدود تھی۔ زمین پر گرنے والے سُرخ رنگ کو زمین پر سیل سیاہ نگل لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ بڑا بھیانک ڈراؤنا منظر تھا۔

میرے وجود نے اس منظر کو دیکھا۔ میں خود اس منظر میں کھو چکا تھا ـــــ اندھیرے کے اتھاہ سمندر میں میرے دائیں ہاتھ کو بایاں ہاتھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آنکھوں کی روشنی ذہن کی جانب پرواز کر رہی تھی اور یہاں مختلف منظر اُبھرتے تھے لیکن وہ بھی

اس اندھیرے کے احساس کی وجہ سے جلدی ذہن میں تحلیل ہو جاتے تھے اور ذہن میں کالا، گہرا، تنہا خاموش سناٹا ہوتا، جس کو اندھیرے میں میرا ایک تنہا وجود بہت زیادہ محسوس کر رہا تھا۔

میں چاروں جانب گھوم گیا۔ ہر طرف وہی سیل سیاہ تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو آوازیں دیں۔ ان ساتھیوں کے ساتھ میں اس دنیا کے منظر میں تھا، جن کے ساتھ میں نے اس روپہلی دھرتی پر قدم رکھا تھا، جن کے ساتھ میں دھرتی کے سینے پہ بہنے والی ہواؤں اور ندیوں میں اچھلا کودا تھا۔

پہلے جب کبھی میں ان کو آوازیں دیتا تو وہ سب آ جاتے۔ پھر ہم مل کر کسی کھیت کسی ندی، کسی سڑک پہ خوشی کے نغمے الاپتے، خوش گپیاں کرتے، کلیلیں بھرتے، قیامت سے لے کر جوانی تک کی باتیں کرتے۔ دھرتی کی ساری خوشیاں ہماری تھیں۔

ایک دن ہم یوں ہی مگن گھوم پھر کر اپنے ڈیرے پہ پہنچے۔ میرا ڈیرا وہاں نہ تھا، پتہ نہیں کیا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا، کوئی زلزلہ اسے نگل گیا ہے یا کوئی آندھی اسے اڑا لے گئی ہے، یا پھر کوئی طوفان بہا لے گیا ہے۔

میرے ساتھ ایسا ہوا تھا۔ میرے دوستوں کے ساتھ کیا ہوا اس کا علم نہ تھا۔ لیکن جہاں ہمارے ڈیرے تھے وہ دھرتی کا ایک ہی ٹکڑا تھا۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے؟ اسی وقت ایک سرگوشی سنائی دی۔ میں اسی سمت بڑھا تو انجانی سی آواز ابھری۔ اس آواز میں بڑا کرب تھا۔ آواز میرے قریب سے آ رہی تھی۔ میں پوری طرح آواز کی جانب متوجہ تھا۔

"میرے بیٹے! یہ دھرتی تمہاری تھی......"

میں نے فوراً کہا:

"تھی —— کیا مطلب؟"

"پہلے میری بات سنو! آج تمہارے ڈیرے اجاڑ دیے گئے۔ یہ سب یوں ہی نہیں ہوا۔ یہ نفرتوں کی آگ کا شکار ہو کر بھسم ہو گئے ہیں اور یہ آگ ہر طرف تانڈو ناچ ناچ

رہی ہے ۔ ایک طرف نفرت کی آگ، دوسری طرف تمہارا وجود ہے جس کو یہ آگ اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ اب یہاں تمہارا گزر اندھیرے میں ہے ۔ تم کسی بھی وقت نفرت کی دہکتی کھائی میں گر سکتے ہو۔ کب تک سنبھل کر چلو گے ؟ دیکھو اب بھی سویرا ہے بکھر جاؤ ۔ اس نفرت کی اندھی کالی آگ سے دُور نکل جاؤ ۔ تم محفوظ رہو گے ۔"

مَیں نے دیکھا ایک روشن ہیولا ایک سمت رینگ گیا۔ سمت کا اندازہ مجھے نہیں ہو سکا۔ اس کرب ناک آواز کا اثر مجھ پر صرف اتنا ہوا کہ میں سوچنے لگا : میرے دوستوں نے یہ آواز سنی ہو گی، تو یقیناً خوف کے زیرِ اثر وہ بکھر چکے ہوں گے ۔ بہتر نقطے کی تلاش میں نکل چکے ہوں گے ۔ مجھے ان کی فکر تھی۔ سب ایک ساتھ ہوتے تو بہتر صورت نکل سکتی تھی، مَیں سوچ رہا تھا لیکن اس بکھراؤ اور ٹوٹ پھوٹ میں وہ کہاں بکھرے تھے اس کا علم فی الحال ممکن نہ تھا ۔

یہ دھرتی اور لوگوں کی طرح میری بھی ہے ۔ مَیں یہاں پیدا ہوا ہوں، پھر مَیں اس دھرتی اور اس دھرتی کے باسیوں کے لیے اجنبی کیسے ہو سکتا ہوں ؟ یہاں طوفان زلزلے، آندھیاں آتی ہی رہتی ہیں ان سے کیا ڈرنا ؟ یہ تو آتی ہی رہی ہیں، آتی رہیں گی، یہ بھی ایک آندھی ہے نفرت کی آگ لیے ہوئے گزر ہی جائے گی ۔

اب اندھیرا اور بھی گہرا ہو چکا تھا اور مَیں خوف محسوس کر رہا تھا۔ اس دھرتی پر مَیں نے کہیں بھی، کسی بھی وقت قدم رکھتے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن اس وقت سیلِ سیاہ میں میرا وجود مدغم ہو چکا تھا۔ مَیں نے اپنے دوستوں کو آوازیں دیں۔ لیکن میری آواز اندھیرے کی دبیز چادر میں دب گئی ۔ میری حالت غیر ہو چکی تھی ۔ میرا ذہن خالی ہو چکا تھا۔ تمام یادیں، منظر، سوچ سب کالے مہیب اندھیرے میں تحلیل ہو چکے تھے ۔

بہار کے دنوں کی یاد
دھوپ میں جھلس گئی

کہ زرد پھول دور دور کھل اٹھے

زمیں پہ اب کوئی جگہ نہیں بچی

کہاں یہ خواہشوں کے بیج بو دُوں

مجھے تو بس اس فیصلے کا اختیار ہے

ہنسوں کہ اور روؤں میں ...... [1]

یہ سب کیا ہُوا؟ کسی سے پوچھنا ممکن نہ تھا کہ اس سوال کا جواب دینے والا وہاں کوئی نہ تھا۔ میں خود ہی اس سوال کا جواب سوچتے ہوئے ایک سمت بڑھنے لگا۔

میرے ذہن میں ایک بات آئی کہ جب ہر طرف اندھیرا پھیل چکا ہے، نفرت کی کالی آگ ہر سمت دہک چکی ہے تو اس آگ کو دہکانے والے بھی اس آگ سے محفوظ نہیں ہو سکتے، اس جواب کے سوجھنے پر مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ لیکن غیر اطمینانی وسیع تر تھی، اس لیے یہ اطمینان جلد ہی زائل ہو گیا اس کے بعد میرے ذہن میں بھی باہر کی طرح ہو کا عالم تھا۔

میں نے اوپر دیکھا آسمان سرخ تھا، جیسے دُور سے ریل کا سگنل دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے آنکھ کا سفر نیچے ہوتا جاتا ہے آنکھ اندھی ہوتی جاتی ہے۔

اس عجیب و غریب کیفیت اور ماحول میں بھی ذہن اس بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ یہ اندھیرا نفرتوں نے پھیلایا ہے۔

مَیں نے دونوں ہاتھ آگے پھیلائے اور دھیرے دھیرے قدم بڑھائے ــ اندھیرا پانی کی طرح مجھے اپنے اندر دھنساتا چلا گیا۔ اور مَیں دھنستا چلا گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد مَیں رک گیا۔ سمتوں کا قیاس تک مٹ چکا تھا۔ ایسے وقت بہت سوچ کر قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ مَیں یہ سوچ رہا تھا کہ اب کس سمت قدم بڑھاؤں؟ آگے، دائیں، بائیں یا پیچھے ــ؟ لیکن پیچھے سے تو میں یہاں تک آیا تھا۔ مَیں نے سیدھا پیر اٹھایا اور آگے کی جانب رکھ دیا۔ پھر میرے قدم آگے کی جانب بڑھنے لگے۔

---

[1] شہریار

بچپن میں ایک بار ہمارا ٹور ایک اونچی پہاڑی پر گیا تھا۔ بارش کا زمانہ تھا۔ پہاڑ پر بادلوں کے دل آتے اور ہمارے درمیان سے گزر جاتے۔ چند لمحوں کے لیے ہم ان بادلوں کے کالے کالے ٹکڑوں میں چھپ جاتے لیکن ہمیں ایک دوسرے کے قہقہے سنائی دیتے۔ اچھل کود محسوس ہوتی۔ یہ صرف لمحہ بھر کو رہتا۔ اس لمحہ بھر کے بعد پھر ہم نشاط و انبساط کی لازوال دنیا میں کھوئے رہتے۔ لیکن یہ سیل سیاہ خوف پیدا کر رہا تھا۔ میرا وجود ساری خوشیاں، سوچیں بھول کر کپکپا بھی رہا تھا اور ڈگمگا بھی رہا تھا۔

اسی وقت میں نے تیرنے کے انداز میں دونوں ہاتھوں سے اپنے سامنے کے اندھیرے کو کاٹا اور جوں ہی میرا ہاتھ لہرایا، تو میرے ہاتھ سے دوسرا ہاتھ ٹکرایا۔ میں نے فوراً ہی اس ہاتھ کو پکڑ لیا۔ یہ بھی خوف کا اثر تھا کہ میں نے اس ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میرے ذہن کی غنودگی اچانک ہوش میں تبدیل ہو گئی اور میری یادیں واپس آ گئیں۔

یادوں کے واپس آتے ہی میرے دوستوں کے نام میری زبان سے ادا ہوئے۔ طارق، سجاد، نشاط، نجم، دیپک، حنیف اور پرکاش...... چند لمحوں کے بعد ہی ہم ایک دوسرے کی باہوں میں تھے۔ اس اچانک ملاقات پر ہم دونوں بے حد خوش تھے۔ اس سیل سیاہ میں ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے صرف محسوس کر سکتے تھے۔

میں نے پوچھا:

"تم کون ہو؟"

اس نے کہا:

"پہلے تم بتاؤ۔"

میں نے فوراً کہا:

"میں احمد ہوں احمد!"

اس نے اپنی باہوں کا گھیرا خوشی سے تنگ کرتے ہوئے کہا:

"میں دیپک ہوں۔"

میں نے ہمیشہ کی طرح مذاق کرتے ہوئے کہا:

"تو جل جاؤ پھر۔ !"

اس نے کہا:

"دوست! جل سکتا تو ساری دنیا کے اندھیرے کو جلا ڈالتا۔ لیکن میں بھی تمہاری طرح اس اندھیرے کا حصہ ہوں۔"

اس کی آواز میں بڑا درد تھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ شاید اس کے ذہن میں بھی باہر کی طرح ہُو کا عالم در آیا ہو۔ چند قدم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہم چلتے رہے۔ پھر میں نے کہا:

"دیپک! ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"معلوم نہیں!"

"تو پھر؟"

"بس چلتے رہو!"

ہم نے پھر چلنا شروع کر دیا لیکن سنبھل سنبھل کر۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد دیپک نے کہا:

"یار احمد! وہ نظم سُناؤ جو تم اکثر سناتے ہو۔"

"کون سی؟"

"وہی رگِ جاں میں۔"

"اچھا سنو! لیکن زچ ہے ــ کہ یہ زچ کا محل ہے۔"

"اچھا سُناؤ۔"

ہر طرف

سنگِ اذیت کی مسلسل بارشوں کا زور ہے

آنکھ کی بینائی، تالو،

کنپٹی محفوظ رکھوں

کس طرح کس ڈھنگ سے

ان کا تحفظ ہو سکے

راستوں کے پیچ و خم ہیں

یا شکستہ پل گزرنا ہے محال

...... اور رگِ جاں میں

سفر پیہم سفر کی روشنی سی جھلملاتی ہے [1]

"بس پڑھتے رہو پیہم" دیپک نے جھومتے ہوئے کہا "لیکن روشنی کی کرن بھی کہیں نہیں جھلملاتی نظر آتی ہے۔ ہم سیل سیاہ کے سمندر میں اترتے جا رہے ہیں۔"

مَیں نے کہا:

"پرواہ نہیں۔ ابھی تو رات کا منظر ہے۔ صبح تو ہونے دو۔ یہ سرخ آسماں سپیدی میں تبدیل ہو جائے گا پھر یہ سیل سیاہ ختم ہو جائے گا۔"

مجھے خاموش دیکھ کر وہ میری طرف مڑا اور کہا:

"یار معلوم ہوتا ہے تو بھی مایوس ہو گیا۔ مَیں جب ڈیرے پر پہنچا تو وہاں کچھ نہ تھا۔ شاید ہم سبھوں کا معاملہ ایک سا تھا۔ مَیں سب سے قریبی ساتھی کی طرف دوڑا وہ مجھے ملا بھی لیکن مجھے دیکھ کر منہ موڑ کر ایک سمت چلا گیا۔ اس کے چہرے پر مایوسی کا اندھیرا چھا گیا تھا۔"

مَیں نے کہا:

"دیپک! مَیں مایوس نہیں ہوں، لیکن تشویش میں مبتلا ہوں کہ کوئی نہ کوئی دوراہا ایسا آئے گا جہاں سے میرے اور تمہارے راستے تبدیل ہو جائیں گے پھر ہم دونوں جدا ہو جائیں گے۔"

---

[1] خمار قریشی

"کیا ہم روزان دو راہوں سے نہیں گزرے؟" دیپک نے سوال کیا۔

"وقت کی بات ہے۔" میں نے گمبھیرتا سے کہا "آج ہم اتفاق سے مل گئے ورنہ ......"

دیپک چلتے چلتے رک گیا اور بولا:

"ایسا اتفاق بھی ہو سکتا ہے کہ میں تم سے بچھڑ جاؤں۔ تمہیں اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے نفرت کی کھائی پاٹنے اور سیلِ سیاہ کو کاٹنے کے لیے میں تم سے جدا ہو جاؤں۔"

لیکن میں اس تشویش میں مبتلا ہوں کہ اس کھائی کو پاٹتے اور نفرتوں کے سیلِ سیاہ کو کاٹتے ہوئے تم میرے مقابل نہ آجاؤ۔"

"تو تم ڈرتے کیوں ہو؟ ڈر اور خوف کو ذہن سے نکال دو۔ اندھیرا اپنے آپ چھٹ جائے گا۔ میں بھی اندھیرے میں دھنس رہا ہوں تو میرے ذہن میں بھی ڈر اور خوف ابھر رہا ہے۔" دیپک نے ہنستے ہوئے کہا۔ چند لمحوں بعد پھر کہا:

"میں نے سوچ لیا ہے کہ اب میں خوف سے پیچھا چھڑا لوں گا۔ روشنی خود ہی خوف کی جگہ لے کر جگمگائے گی۔"

دیپک نے میرے ہاتھ پر پیار بھرا دباؤ گہرا کر دیا۔ جواباً میں نے بھی ویسا ہی کیا۔
اب ہمارے پاؤں شل اور شانے بوجھل ہو رہے تھے۔ ذہن کی کائیاں چھٹ گئیں۔ اس وقت ہم نے آسمان کی جانب دیکھا۔ آسمان کی سرخی سفیدی میں تبدیل ہو رہی ہے سفیدی دھرتی کی جانب سفر کرتے ہوئے سیلِ سیاہ کے سینے میں اتر رہی ہے۔ اندھیرا گھبرایا ہوا اِدھر اُدھر بھاگ رہا ہے۔

●●

۱۳ غضب کی چاندراتیں

چار پانچ گلیوں کا گاؤں تھا۔ چھوٹے چھوٹے کچی مٹی کے گھر اور کچھ چھپر تھے۔ کچی گلیاں۔ پندرہ بیس منٹ گھومو تو گاؤں ختم ہو جاتا۔ شمال کی جانب پہاڑ کھڑا ہوا تھا جو ٹیلے نما تھا اور جنوب کی جانب ندی تھی۔ مشرق اور مغرب سے گاؤں دوسرے گاؤں اور شہر سے جڑا ہوا تھا۔ ایک کچی سڑک مغرب سے آتی تھی اور مشرق کی طرف نکل جاتی تھی۔

گاؤں دو گلیوں کا ہو کہ دو گھروں کا، گاؤں ہوتا ہے، جہاں زندگی کی رعنائیاں جنم لیتی ہیں۔ زندگی کی خوشیاں اور غم ہوتے ہیں۔ محبت، نفرت، عداوت، سب کچھ ہوتا ہے۔ لوگ باگ اپنے اپنے کاموں میں مگن رہتے تھے لیکن ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں برابر شریک رہتے۔ کام دھام نہ ہوتا تو گاؤں کی چوپال پر بیٹھ کر پرانے وقتوں کے قصے کہانیاں سنتے یا ایک دوسرے کی برائی اچھائی بیان کرتے، بیڑیاں پھونکتے یا چلم سلگتے۔

جب کبھی پرانے قصے کا دور چلتا تو پیپل کے درخت اور سائیں پھر گشتہ کا ذکر ضرور آتا۔ اس قصے کو بڑے بوڑھے جوان بچے بڑے غور سے سنتے۔

پیپل کا درخت جمو نائی کی دیوار سے اگا تھا۔ پہلے پہل کسی نے دھیان نہیں دیا تھا۔ جب جمو نائی کی دیوار گری اور دوسرے دن اس کی بیوی بیمار ہوئی تو سمجھ لیا گیا کہ پیپل کے درخت نے اپنی کرامت شروع کر دی ہے۔ جمو نائی تو گاؤں ہی چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ گاؤں والوں نے درخت کے اردگرد چبوترا بنا دیا تھا کہ لوگ دور سے گزریں اور پیپل پر براجمان انجانی شے سے

محفوظ رہیں۔

لیکن گاؤں میں کوئی شے ہو تو اُس سے بچنا محال ہوتا ہے۔ آئے دن کچھ نہ کچھ ہوتا تو فوراً پیپل کا کرشمہ مان لیا جاتا۔ اب گاؤں میں پیپل کا درخت، اس پر براجمان شے کے ساتھ ہی عامل اور عالم بھی پیدا ہو گئے، گاؤں والے ان کو "جانتے" کے نام سے پکارتے تھے۔

پیپل، شے اور عاملوں کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ کچھ بڑے بوڑھوں کا خیال تھا کہ پیپل کا درخت وہیں اُگتا ہے جہاں "جانتا" ہوتا ہے۔ یا جانتا وہیں پیدا ہوتا ہے جہاں پیپل کا درخت ہوتا ہے۔

اب ہر بیماری کا علاج جانتے کرتے تھے۔ جب اُن سے بیماری نہیں سنبھلتی تو دوسرے گاؤں کے بڑے جانتوں کو بلایا جاتا ہے۔

مریض کبھی اچھے ہوتے، کبھی اللہ کو پیارے ہو جاتے۔ مریض کے مرنے کی ساری ذمہ داری پیپل والی شے پر ڈال دی جاتی تھی۔ بچوں اور نوجوانوں کو سخت تاکید تھی کہ وہ پیپل والی گلی میں نہ جائیں۔ انہیں ڈرایا جاتا کہ اگر گئے تو مر جاؤ گے جس طرح ننھو کی بیٹی مری۔ بچے سہم جاتے۔ پیپل والی گلی سنسان پڑی رہتی۔ درخت کا سایہ ٹالنے کے لیے لوگ دو چار قدم دور سے چلنا پسند کرتے تھے، دوسری گلی سے آتے جاتے تھے۔ شام سے پہلے اس گلی میں ہو کا عالم ہوتا تھا۔ اماوس اور پونم پر تو یہاں بھیانک سناٹا ہوتا کہ اس سناٹے سے ہی ڈر محسوس ہوتا تھا اور مضبوط سے مضبوط دل بھی دہل جاتا۔

بڑے بوڑھوں کے مطابق، چاندراتوں میں یہاں بڑا دھمال ہوتا تھا۔ آسیبی طاقتیں جمع ہو کر نئے منصوبے بناتی تھیں۔ اگر ایسے میں کوئی وہاں پہنچ جاتا تو اسے اپنے نرغے میں لے کر اس کی زندگی تباہ کر دی جاتی۔ ایسے وقت میں شے اور بھی غضبناک ہو جاتی کہ اس کے سکون میں آدم نے خلل ڈالا۔

لیکن کبھی کبھی بہت سارے بندر گاؤں میں آتے تو اسی پیپل کے درخت پر ڈیرا جماتے۔ ان کے لیے یہ درخت اس لیے بھی اچھا تھا کہ اس کے اردگرد بڑا سا چبوترہ تھا، جہاں بندر

بڑی بے فکری سے آرام کرتے، یا پھر فوجی ڈسپلن کے ساتھ قطاروں میں بیٹھ کر ایک دوسرے کی جوئیں چنتے اور منہ میں ڈالتے تھے۔ یہ کام وہ اتنے انہماک سے کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا اسی کام کے لیے پیدا ہوئے ہوں۔

بچے بندروں کو دیکھ کر سوچتے کہ انہیں ڈر خوف کیوں نہیں ہوتا؟ ضرور آسیب بندروں سے چھوٹا ہوگا اس لیے بندروں کے آتے ہی کہیں بھاگ جاتا ہوگا۔ بچے بندروں سے ڈرتے بھی تھے لیکن ان کی عجیب حرکتیں اور کرتب دیکھ کر خوش بھی ہوتے تھے۔ بندر کبھی کھیت میں جاتی ہوئی عورتوں کا ٹوکرا سر پر سے گرا کر روٹی لے بھاگتے۔ کبھی کسی بچے کے سر کی ٹوپی اتار لیتے اور باری باری سب پہنتے، کبھی ٹوپی واپس بھی کر دیتے۔ اُن کی اوں اوں، چک چک اور کھیکھ کھیکھ سے پورا گاؤں دن میں ایک بار ضرور گونج اٹھتا۔ پھر بندر بھی کسی سمت نکل جاتے تو پیپل کا سونا پن اور بھی ڈراؤنا ہو جاتا۔

ایک سال ایسا ہُوا بندروں نے پیپل خالی کیا ہی تھا کہ کسی سمت سے آکر ایک سادھو نے اسے آباد کر دیا۔ گاؤں والوں نے اس کا نام ہی سائیں پھر گشتہ رکھ دیا۔ اب پیپل کے نیچے اُس کا ٹاٹ بچھ گیا تھا جو اتنے بڑے چبوترے پر اس کا پیوند معلوم ہوتا تھا۔ سائیں پھر گشتہ کی کل کائنات ایک جھولی، ایک گلاس رکابی، ایک گودڑی اور تھیلی تھی۔

پہلے تو لوگوں نے سائیں کو حیرت سے دیکھا۔ دو ایک بوڑھوں نے اسے پیپل کی نحوست سے آگاہ بھی کیا۔ مگر سائیں نے ہنس کر کہا:

" بابو جی جس شے کی بات کرتے ہو نا اُسے "موبنجا" کہتے ہیں۔ وہ تو ہمارا غلام ہے۔ دیکھنا اب وہ گاؤں والوں کو کبھی نہیں ستائے گا۔ اور جس دن اس نے کسی کو ستایا، اُس دن اُسے گاؤں چھوڑنا پڑے گا۔"

سائیں کی اس بات سے گاؤں والوں کو اطمینان نہ ہُوا۔ پہلے پہل وہ سائیں سے بھی ڈرتے لگے تھے۔ لیکن دھیرے دھیرے ان کا خوف ختم ہُوا، کیوں کہ سائیں ان میں گھل مل گیا تھا۔ کبھی کبھی وہ چوپال پر جا کر چلم کے کش اڑایا کرتا تھا اور گاؤں والوں کو شہروں کی باتیں،

ریل اور ہوائی جہاز کی باتیں، لڑائیوں کے قصے، پہاڑوں میں رہنے والے جٹا دھاری سادھوسنتوں کی کہانیاں ایسے انداز میں سناتا کہ لوگ چاہتے وہ بولتا ہی رہے۔ یہ باتیں اُن لوگوں کے لیے بالکل نئی اور انوکھی تھیں، کیوں کہ وہ صرف موسموں کو پہچانتے تھے، فصلوں کو اگانا جانتے تھے۔ بہت ہُوا تو قریبی گاؤں میں جا کر اناج بیچ آتے، یا گاؤں کے ہی بنیے کو دے کر چھٹی پا جاتے تھے۔

سائیں کا پھیرا گاؤں میں ہُوا تو جوان لڑکے بالے اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ وہ نوجوانوں سے زیادہ گھُل مِل جاتا۔ انہیں وہ گالیاں دیتا تو وہ دانت نکال کر ہنستے۔ اس پر وہ اور بھی اول فول بکتا۔ مگر لڑکے بڑے پیار سے اسے "بابا" کہتے۔ کبھی کبھی لڑکے اسے چِڑاتے:

"یہ پھیر گشتہ کیا بلا ہے؟"

بابا مسکرا کر کہتا:

"حرام کے جنو! پھیر گشتہ نہیں، سائیں پھیر گشتہ!! پُورا نام کیوں نہیں لیتے چھنال کو!!!" لڑکے پھر ہنسنے لگتے۔

بابا کسی لڑکے کے کہنے پر کہانی سناتا۔ وہ کہانی کبھی پوری نہیں کرتا تھا۔۔۔ وہ کہتا:

"وہ رات غضب کی چاندرات تھی۔ میں اپنی راہ پر چل رہا تھا کہ میرے بازو میں ایک پری آ کر چلنے لگی۔"

وہ خاموش ہو جاتا جیسے کچھ سوچ رہا ہو یا پھر اُسی راہ پر چل نکلا ہو۔ لڑکے تھوڑی دیر خاموشی کو برداشت کرتے۔ پھر کوئی ایک دھیرے سے کہتا:

"پھر کیا ہُوا بابا؟"

سائیں چونک کر لڑکوں کی طرف یوں دیکھتا جیسے طویل مسافت سے لوٹ آیا ہو۔

"پھر کیا ہوگا؟ وہ ساتھ ہوئی تو جیسے چاند دھیرے دھیرے اس کے قریب ہونے لگا۔ وہ مسکرائی تو ستاروں کا جھرمٹ اُس کے ارد گرد جمع ہو گیا ــــ اور بجلی سی کڑکنے لگی....."

کوئی دھیرے سے کہتا:

"ستاروں کا جھرمٹ بھی اور بجلی بھی؟"

بس سائیں بھڑک اٹھتا:

"حرامکو! تمہیں کیا معلوم اندر جو بجلیاں کڑکتی ہیں، اندر جو دھمال مچتا ہے۔ جب پڑے گی بیٹا تم پر تو سائیں کو یاد کرو گے سائیں کو۔ چلو بھاگو نہیں سُناتا تمہیں کہانی وانی۔"

لڑکے ایک ایک کرکے اٹھ جاتے۔ سائیں پھر کھو سا جاتا۔ شاید وہ پری کے بازو چلنے کے لیے پیچھے بہت پیچھے لوٹ جاتا ہو۔

سائیں اب پیپل کا ایک حصّہ بن گیا تھا۔ گاؤں والوں کو یقین ہو گیا تھا کہ پیپل والا آسیب جسے سائیں موہنجا کہتا تھا وہ اُس کے تابع ہو گیا ہے۔ تبھی تو سائیں کے آنے کے بعد تسے نے کسی کو نہیں ستایا۔ اب اس گلی سے آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ سائیں کا سہارا لے کر بچے گلی ڈنڈا یا گوٹیاں کھیلتے تھے یا پھر کبوتر اور کوّے اُڑاتے تھے۔

چاند راتوں میں، اماوس ولونم کی رات سائیں سرِ شام ندی نالوں کی طرف نکل جاتا تھا اور پتہ نہیں کب لوٹتا تھا۔ لیکن ان راتوں میں پیپل کے نیچے سے بولنے ہنسنے اور رونے کی آوازیں آتی تھیں۔ جو بالی پرلوگوں نے سائیں سے پوچھا بھی لیکن اس نے مسکرا کر ٹال دیا۔

لیکن منچلے لونڈوں نے پتہ چلا لیا تھا کہ چاند راتوں میں سائیں اپنے جھولے سے کوئی چیز نکالتا، پھر اُسے دیکھ دیکھ کر بات کرتا، روتا، قہقہے لگاتا، کبھی کبھی پیپل کے درخت کو اپنے ہاتھوں کے کلاوے میں بھرنے کی کوشش کرتا اور بار بار کہتا:

"کیوں دی ایسی سزا؟ کیوں دی ایسی سزا؟"

پھر وہ دھیرے دھیرے خاموش ہو کر لیٹ جاتا، اور چبوترے پر پاؤں پسار کر سو جاتا۔

اندھیری راتوں میں کیا ہوتا انہیں معلوم نہیں تھا۔ بوڑھے الگ قیاس آرائیاں کرتے

رونے کی آواز کے بارے میں بتاتے کہ یہ پہلے کبھی نہیں سُنائی دی تھی۔ اگلے وقتوں کے لوگ بتاتے

تھے کہ جب کبھی فصلوں کا نقصان سیلاب یا سوکھے سے ہونے والا ہوتا تھا یا پھر کسی بڑے آدمی

کی موت ہوتی تھی یا گاؤں پر کوئی آفت آنے والی ہوتی تو پیپل سے رونے کی آوازیں آتی تھیں۔

پھر وہ واقعات کی عمر کا حساب جوڑتے اور بتاتے کہ فلاں وقت مانی موڑی دگردن توڑ بخار یا

طاعون) آئی تھی اسے اتنے سال بیت گئے۔

پھر وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور کوئی خوف زدہ آواز میں کہتا:

"اب کیا ہونے والا ہے؟ کیوں کہ اب تو روتے، بولنے اور قہقہوں کی آوازیں

آتی ہیں۔"

بہت دنوں تک سائیں گاؤں میں رہا، لیکن کچھ بھی نہ ہُوا، بلکہ شبے اور جانتے

دونوں گاؤں والوں کے ذہن سے نکل گئے۔ سائیں اب گاؤں کا ایک فرد بن گیا تھا، اچھّے برے

میں شامل رہتا، مشورے دیتا، لوگ اس سے خوش تھے۔

ایک صبح سائیں دیر تک سوتا رہا۔ سورج کی تیز دھوپ بھی اسے نہ جگا سکی، تو

نیچے جامو نے چلم کی طلب سے مغلوب ہو کر سائیں کو آوازیں دیں۔ وہ تب بھی نہ اٹھا تو جامو نے

اسے ہلایا تو وہ بے جان کی طرح ہلتا جلا گیا۔ تب جامو نے چیخ پکار کی تو سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔

بڑی دھوم دھام سے سائیں کی ارتھی اٹھی۔ بڑے ادب و احترام سے لوگوں نے

اس کا انتم سنسکار کیا۔

سائیں نے گاؤں والوں کو ہدایت کی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی ساری چیزیں

بغیر دیکھے پیپل کے درخت کے نیچے دفنا دی جائیں۔ لیکن ایک منچلے نے جھولے میں ہاتھ ڈال کر جو

چیز اس کے ہاتھ لگی، وہ نکال لی وہ ایک تصویر تھی۔ نوجوان نے وہ تصویر جیب میں ڈال لی۔

ساری چیزیں دفنا دی گئیں۔

لڑکے نے اکیلے میں تصویر دیکھی تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس نے چاند کے علاوہ

اتنی خوبصورت چیز دیکھی نہیں تھی۔ وہ رات بھر سو نہ سکا۔ صبح ہوتے ہوتے وہ بخار میں تپ چکا تھا۔ برسوں بعد جانتوں کی ضرورت پڑی۔ ایک جانتے کو بلایا گیا۔ اُس نے بتایا کہ کسی شے نے رات بھر اس لڑکے کو تنگ کیا ہے تو لڑکے نے جھٹ وہ تصویر سامنے رکھ دی اور بتایا کہ یہ تصویر اُس نے سائیں پھر گرشتہ کے جھونپڑے سے چرائی تھی اور بتایا کہ سائیں پھر گرشتہ رات بھر اس کے خواب میں آتا رہا اور بولتا رہا:

"میری چیز واپس کر! میری چیز واپس کر!"

اب گاؤں والوں کی سمجھ میں آیا کہ سائیں پھر گرشتہ کیوں چاندراتوں میں روتا تھا اور کس لیے چاندراتوں کا عذاب جھیلتا تھا۔

انہوں نے فوراً ہی اس پری کی تصویر کو بھی پیپل کے نیچے دفنا دیا۔ تب سے آج تک گاؤں میں کوئی واردات نہیں ہوئی اور آج بھی یہ پیپل "سائیں کا پیپل" کے نام سے مشہور ہے۔

••

۱۴ پتھرائی آنکھیں

یہ شہر صرف شہر ہی نہ تھا بلکہ شہر آرزو تھا۔ ہر کوئی اس شہر میں پناہ لینے کے لیے طول وعرض، سمت بے سمت سے چلا آتا تھا۔ یہاں کھلی فضا تھی، تازہ ہوا تھی، مہکتا موسم تھا، مچلتا پیار تھا۔ ہر کلی کا دل اپنے چاہنے والے کے لیے دھڑکتا تھا۔ روشن چہرے، چوڑی پیشانی، کرخت ہاتھوں کا یہ شہر اپنی گرم محبت اور نرم گفتاری اور شب روز کی محنت کے لیے مشہور ہو گیا تھا۔

اسی شہر میں وہ دونوں بھائی اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ ایک مصروف اور بھری پری شاہراہ پر کچی اینٹوں کے بنے مکان میں رہتے تھے۔ ماں ان دونوں کا کھانا پکاتی، بڑے پیار سے دونوں کو کھلاتی اور کہتی:

"بیٹا! اب میں تھک گئی ہوں۔ اب تم دونوں کی شادی ہو جائے تو مجھ بوڑھی کو آرام وسکون ملے۔"

دونوں بھائی سال بھر آگے پیچھے کے تھے، اس لیے دونوں ایک ہی عمر کے معلوم ہوتے تھے۔ محنتی تھے۔ خوب محنت کرتے، ڈٹ کر کھاتے اور پاؤں پسار کر سو جاتے۔ ان کی زندگی بس کام، گھر، ماں اور نیند تک محدود تھی۔

ماں دلار سے ان کی شادی کے بارے میں کہتی تو دونوں کے گال تمتما اٹھتے۔ ماں ہفتے پندرہ دن میں پاس پڑوس یا دوسرے محلے کی کوئی لڑکی دیکھ آتی تو ان کو بتاتی: آج میں

نے لڑکی دیکھی ہے۔ لیکن مجھے پسند نہیں۔ میری دونوں بہویں تو جیسے چاند، سورج ہوں گی۔ پھر وہ جیسے تصور ہی تصور میں چاند سورج کی دنیا میں کھو جاتی۔ خیال ہی خیال میں چاند، سورج کی روشنی میں نہا جاتی۔

زندگی یوں ہی صبح و شام میں تبدیل ہو رہی تھی۔ ایک دن بڑا بھائی ماں کی اجازت سے قریبی شہر میں اپنے دوست کی شادی میں شرکت کرنے گیا ہوا تھا۔ صبح و شام کا چکر، وقت کا چکر، کام کا چکر سب اپنی جگہ درست تھے کہ اچانک جیسے بم گرا۔ جس شاہراہ پر ان کا مکان تھا وہاں جیسے جنگ چھڑ گئی۔ چھوٹا دوڑتا ہوا آیا اور جلدی سے کھڑکی دروازے بند کر لیے۔ یہاں پر ایسی ایسی بھیانک آوازیں آتیں کہ دل لرزنے لگتا۔ آہ و بکا کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ایک قیامت تھی کہ پل پل ٹوٹ رہی تھی۔ دونوں ماں بیٹے بڑے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

بیٹے نے ماں سے کہا:

" ماں تو فکر نہ کر وہ تو شادی میں مزے کر رہا ہو گا، وہاں تک خبر پہنچ چکی ہو گی تو بھیا نہیں آئے گا۔ وہ لوگ اس حالت میں آنے بھی نہ دیں گے۔" ماں کبھی مطمئن کبھی بے چین ہو جاتی۔

اسی آہ و بکا کے گزرتے لمحوں میں سورج نے دھرتی کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اب اندھیرا تھا۔ آوازیں برابر آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی دونوں طرف کے لوگ خدا کو الگ الگ تصور کر کے اپنی اپنی زبان میں مدد کے لیے پکار رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اُن کا خدا انسانوں کو مارنے کاٹنے اور انسانی جانوں کو ضائع کرنے، املاک لوٹنے، جلانے میں ان کی مدد کرے۔ رات بھر یہ ہنگامہ جاری رہا۔ قیامت صغریٰ نہیں قیامت کبریٰ تھی جو خدا کی مخلوق کے ذریعے مخلوق پر نازل ہوئی تھی۔ وہ اور اس کی ماں کئی بار لرز لرز گئے تھے۔

وہ شادی میں اپنے دوستوں کے ساتھ مگن تھا۔ قہقہوں میں گم تھا۔ مسرت اور شادمانی اس کے چہرے سے پھوٹ پڑ رہی تھی۔ اسی وقت یہ خبر وہاں پہنچ گئی کہ شہر آزردہ

میں کشت و خون کا سیلاب اُمنڈ پڑا ہے۔ قیامت نے دھا وا بول دیا ہے۔ سب کی شادمانی پریشانی میں تبدیل ہو گئی۔ چہروں پہ تھوڑی دیر پہلے جو رنگ نکھر آیا تھا وہ مختلف اندیشوں نے بکھیر دیا تھا۔

وہ ماں اور بھائی کی فکر میں ڈوب گیا۔ اور تصور ہی تصور میں وہاں پہنچ گیا۔ جو منظر اس نے دیکھا وہ بڑا بھیانک تھا۔ وہ چیخ پڑا۔ سب لوگ اُس کی جانب دوڑ پڑے۔ اُس نے آنکھیں کھولیں اور کہا:

"میں جا رہا ہوں۔ میری ماں اور میرا بھائی مجھے بلا رہے ہیں۔"

وہ چل پڑا۔ لوگوں نے اُسے بہت روکا کہ اس وقت جانا خطرے سے خالی نہیں، لیکن وہ نہ مانا اور چل پڑا۔ وہ جب شہر میں پہنچا تو رات کافی بیت چکی تھی۔ ایسا لگتا تھا جگہ جگہ الاؤ روشن ہو چکے ہیں۔ آگ کی لپٹیں کسی خونخوار درندے کی لپ لپ کرتی زبان کی طرح آسمان کی طرف لپک لپک جاتیں۔

وہ ایک اندھیری گلی میں مُڑا۔ وہ جان بوجھ کر تنگ و تاریک گلیوں سے گھر کی جانب بڑی احتیاط سے بڑھ رہا تھا۔ گھر ابھی کافی دُور تھا۔ کبھی کبھی کوئی چیخ یا پھر مختلف بھیانک آوازیں اُسے چونکا دیتی تھیں۔ وہ اپنے بھائی اور ماں کی محبت میں گرفتار بڑھتا ہی رہا۔ تمام دروازے بند تھے۔ ہر مکان مقبرہ معلوم ہوتا تھا۔ مہیب سناٹے میں ڈوبا ہوا۔

ابھی وہ آدھی گلی ہی پار کر پایا تھا کہ دو طرف سے دو سائے نکلے اور دو تیز چھرے اس کے بدن کو چھید گئے۔ اُس کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی۔ وہ گر گیا۔ تھوڑی دیر تک جیسے اس پہ موت طاری ہو گئی۔ پھر وہ اٹھا اور بمشکل اپنے گھر کی جانب لڑھکنے لگا۔

اسے یوں لگا جیسے گھر پہنچتے پہنچتے ایک صدی بیت گئی ہو۔ اس کی حالت نیم مردہ سی ہو گئی۔ جہاں وہ دم لینے کے لیے رُکتا وہاں خون کا چشمہ سا بن جاتا۔ پھر بھی وہ اپنے دروازے پہ پہنچ ہی گیا۔ اُس نے دروازہ کھٹ کھٹایا، ماں کو، بھائی کو پکارا۔ لیکن ایک کونے میں ماں بیٹے دبکے ہوئے تھے۔ باہر کی لرزہ دینے والی آوازوں پر اُن کے کان لگے ہوئے

تھے۔ ایک دو بار کھٹ کھٹ کی آواز آئی بھی۔ چھوٹا دروازہ کھولنے بڑھا۔ لیکن ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ——— "نا نا چھوٹے دروازہ نہ کھول ورنہ درندے اندر گھس آئیں گے۔ وہ ہمیں مار ڈالیں گے۔" چھوٹا پھر ماں کی گود میں دبک گیا۔

صبح کافی دیر گئے انہوں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تو بڑے کی لاش دروازے پر ماتھا ٹیکے پڑی تھی۔ بڑے کے جسم کا خون بہہ بہہ کر جم چکا تھا۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں کسی کی راہ دیکھ دیکھ کر پتھرا گئی تھیں۔ چھوٹے نے چیخ ماری۔ ماں دوڑتی ہوئی آئی اور بڑے پر گر گئی۔ اُس کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ آخر ماں کب تک روئے گی؟ کتنی بار روئے گی؟ کتنوں کے لیے روئے گی؟ ماں کی آنکھیں بھی پتھرا گئیں۔ اور پتہ نہیں کب تک پتھرائی رہیں گی......؟

●●

۱۵ تشنہ لب

واجد نے اپنے کمرے کی دیواروں پر نظریں ڈالیں۔ کمرے کی چاروں دیواروں پر اس کی آرزو تصویروں کے روپ میں تھی۔ ننھے منے بچوں کی تصویریں، مسکراتے بچوں کی تصویریں، کھیلتے بچوں کی تصویریں، جو مسکرا مسکرا کر اُسے دیکھ رہے تھے۔

واجد نے غور سے دیکھا تو اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ تصویریں اس کا مذاق اڑانے لگیں۔ اُسے جونہی یہ احساس ہوا وہ ایک جھٹکے سے اُٹھا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ساری تصویریں نوچ ڈالیں۔ اُن کے پرزے پرزے کر کے کمرے کے باہر بکھیر دیا۔ اس عمل میں اُس کی زیادہ قوت صرف نہیں ہوئی تھی۔ لیکن وہ پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اس کی پیشانی پسینے میں تر ہو گئی۔ اس کی دونوں بغلوں سے پسینے کی دھاریں بہنے لگیں۔ وہ اپنی ایزی چیئر پر بیٹھا تو اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ برسوں کا تھکا ہوا ہے۔ اُس نے آنکھیں موند لیں۔

اس کے سامنے اس کا ماضی کھڑا تھا۔ خوش حال ماضی، رنگین ماضی ـــ اس کے ماں باپ شہر کے چند نامی گرامی لوگوں میں سے تھے۔ وہ کبھی پیدل نہیں چلا تھا۔ جب وہ اسکول جانے لگا تو اس کو کوٹھی کے دروازے سے ہی شوفر کار میں بٹھا کر لے جاتا اور اسکول کے گیٹ پر سے کوٹھی تک لاتا تھا۔ یہ سلسلہ کالج تک چلا گیا۔ پھر اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اس کی زندگی میں جہاں بہت ساری خوشیاں تھیں وہاں نسرین ایک اور خوشی بن کر آ گئی۔ اب وہ ایک بالغ شادی شدہ آدمی تھا۔ اس لیے اپنے

خاندان سے الگ ایک کوٹھی میں رہنے لگا۔

نسرین اس کے لیے سب کچھ تھی۔ لیکن چند ہی دنوں بعد اُس نے محسوس کیا کہ نسرین اس سے دُور ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اس نے اُسے اپنی بے جا چاہت کا نام دے کر خود کو مطمئن کر لیا۔ لیکن اندر ہی اندر ایک خلش سی اُس کے اندر چبھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

اور ایک دن، صبح بھیانک بن کر اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ نسرین اسے سوتا چھوڑ کر گھر کے نوکر سمیت غائب تھی۔

اس نے اپنے دل پہ پتھر رکھ لیا۔ اپنے آپ کو سب کچھ سہنے کے لیے تیار کر لیا۔ اور سوچ لیا کہ اب وہ بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے گا۔ ماں باپ کی بات نہیں مانے گا۔۔۔ اس دن بھی اس نے دیواروں پہ لگی حسین تصویروں کو پھاڑ دیا تھا اور تھک کر بیٹھ گیا تھا۔

اُس کے پاس سب کچھ تھا۔ لیکن اس کی تنہائی کا ساتھی کوئی نہ تھا۔ اس لیے وہ شہر کی سڑکوں پر گشت کرتا، ہوٹلوں میں وقت گزارتا، یا پھر اپنے باغ میں پودوں کی دیکھ بھال کرتا۔ ان ہی دنوں اُس کی ملاقات شبّو سے ہو گئی۔

خوب صورت، خد و خال، مناسب بدن بھولی بھالی شبّو۔ کچھ دنوں بعد ہی دونوں کی دوستی محبت میں تبدیل ہو گئی، پھر دونوں نے اپنی مرضی سے شادی کر لی۔

ایک بار پھر واجد کی زندگی کا خلا پُر ہو گیا۔ دو سال یوں ہی ہنستے کھیلتے بھاگ گئے۔ ایک دن واجد سے ملنے اس کے رشتے کی خالہ آئیں۔ اُس وقت واجد گھر پر ہی تھا۔ خالہ بی بی کو دونوں نے سلام کیا تو خالہ جی بی نے دلہن بیگم کو ڈھیر ساری دُعائیں دیں۔ لیکن ساتھ ہی اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا:

"ہائے دلہن! ابھی تک ہماری گود سُونی ہے۔ یہ ہمیں پسند نہیں۔"

شبّو شرما گئی اور وہاں سے اُٹھ گئی۔

خالہ کی بات شبّو سے زیادہ واجد کو لگی تھی۔ اُدھر دلہن کے اندر کی خواہش بھی

بیدار ہوگئی اور شبّو نے اس کا اظہار واجد پر کر دیا۔

شبّو تو اللہ توکّل تھی، لیکن خالہ بی بی کی بات سے جیسے دونوں کے اندر ایک بال سی دراڑ پڑ گئی اور روز بروز یہ لکیر گہری ہوتی چلی گئی۔

خالہ بی بی تو کب کی جا چکی تھیں لیکن انہوں نے یہاں دونوں میں دُوریاں چھوڑ دی تھیں۔

ایک دن شبّو نے روتے ہوئے کہا:

"اب بہت ہوگیا۔ میری برداشت سے باہر۔ اب آپ کو فیصلہ کرنا ہوگا۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کی آوارہ گردیاں بڑھ گئی ہیں۔ اور جب آپ گھر پر ہوتے ہیں تو باغ کے پھولوں اور پودوں میں کھوئے رہتے ہیں۔ کیا یہ پھول پودے مجھ سے اہم ہیں؟"

"مجھے یہی محسوس ہوتا ہے کہ نئے اُگنے والے پودے اور نئے کھلنے والے پھول تم سے اہم ہیں۔" واجد نے کہا "میں فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں۔"

شبّو ایک جھٹکے سے اٹھی اور اپنا سامان سمیٹ کر اس نے جاتے جاتے واجد سے کہا:

"یہ ہے میرا فیصلہ!"

واجد پھر اکیلا رہ گیا۔ اُس دن بھی اُس نے اپنا سارا غصّہ تصویروں پر اتارا تھا اور تنہائیوں کے غار میں چلا گیا تھا۔ لیکن اب اُس کے سامنے کوئی ماضی نہ تھا۔ اس نے ماضی کو یکسر بھلا دینے کے لیے اپنی آنکھیں موند لی تھیں۔ لیکن ماضی اس سے چمٹا ہوا تھا۔ آنکھیں موندتے ہی منظر پہ منظر بدلتے تھے اور وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا تھا۔

اس نے شبّو کے ملنے سے پہلے والی زندگی پھر شروع کر دی تھی۔ اس کی سفید فیاٹ اس کے اضطراب اور بے چینی کی طرح کبھی اِدھر کبھی اُدھر دوڑتی تھی۔ چند دنوں بعد عورت سے اس کی نفرت کم ہوئی تو وہ جستجو کرنے لگا کہ کوئی جاذبِ نظر چہرہ اپنی طرف متوجہ کر لے۔ اِس لیے اس نے بال روم اور اعلیٰ ہوٹلوں کے چکّر تیز کر دیے۔

وہ روزانہ اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتا، اور سوچتا: اس میں کوئی کمی تو نہیں!
کمی کی کوئی معقول وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ پھر اس کے اندر محرومی کی کسک اٹھتی،
اور دھند اس کے ماضی تک چلی جاتی، جس میں اَن گنت رنگ تھے۔ لیکن اب یہ رنگ ایک
موہوم سی یاد بن گئے تھے اور یہ تمام رنگ اب مل کر کالے ہو چکے تھے۔ واجد پھر سے ان رنگوں
کو اصلی حالت میں لانا چاہتا تھا۔

ایک دن اچانک اُسے خالہ بی بی کا خیال آیا۔ اس نے کار خالہ بی بی کے
گھر کی جانب موڑ دی۔ خالہ بی بی اسے دیکھ کر خوش ہوئیں اور اسے بٹھا کر چائے بنانے
لگیں۔

خالہ بی بی چائے لے کر آئیں تو اُن کے قریب سے ایک لڑکی گزری جو دوسرے
دروازے سے باہر جا رہی تھی۔ واجد نے لڑکی کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی لیکن پہلی جھلک
ایسی کرن ثابت ہوئی جو دل کو چھید دیتی ہے۔ وہ کسی جاذبِ نظر چہرے کو اپنی طرف تو متوجہ
نہیں کر سکا لیکن ایک جاذبِ نظر چہرے پر خود فریفتہ ہو گیا۔

اسے ہلکا سا احساس تھا کہ اس لڑکی کے قدم تو دروازے کی طرف اُٹھ رہے تھے
مگر اس کی چمکتی آنکھیں واجد کی جانب تھیں۔

چائے پینے کے بعد خالہ بی بی خود ہی بولیں:

"واجد میاں! اب تمہیں دیکھ کر ہوک سی اٹھتی ہے۔ میرے بچے تمہاری
عجب قسمت ہے کہ بیوی کا سکھ تمہارے نصیب میں نہیں ہے۔ مگر ہم ایسا کیوں سوچیں؟ اب
پھر سے گھر بسانے کی فکر کر دیجئے۔ اللہ جو کرتا ہے بھلا کرتا ہے۔"

واجد نے کہا:

"خالہ بی بی آپ خود سوچیں اللہ نے مجھے ہر چیز سے نوازا ہے۔ لیکن صرف
ایک چیز شائد میرے حصّے میں نہیں لکھی ہے۔"

خالہ بی بی بولیں:

"ایسا نہ سوچو میاں۔ اللہ سب ٹھیک کر دے گا۔"

واجد نے خالہ بی بی کو ہموار پا کر پوچھا:

"خالہ بی بی یہ لڑکی جو ابھی گئی ہے کون تھی؟"

وہ مسکرائیں اور بولیں:

"میاں یہ پڑوس کے مکان میں رہتی ہے۔ یہ بھی بڑی بدنصیب ہے بے چاری! شادی کے دو سال بعد اللہ نے بیٹا دیا۔ اور تین سال بعد شوہر کو چھین لیا۔ اس کا شوہر پائیلٹ تھا۔ ہوائی حادثے میں شہید ہو گیا۔ اب لڑکا ماشاء اللہ دو سال کا ہونے کو آیا ہے لیکن بے چاری پہاڑ سا غم اپنے سینے پر لیے بیٹھی ہے۔"

واجد تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا پھر چلا آیا۔

جب سے وہ خالہ بی بی کے گھر سے نکلا تھا تب سے دو چمکتی ہوئی آنکھیں اس کا پیچھا کرتی رہی تھیں۔ صبح وہ جلدی اُٹھا۔ نہا دھو کر بہترین سوٹ پہن کر نکلا اور سیدھا خالہ بی بی کے گھر جا دھمکا۔ خالہ بی بی ابھی صبح کی کسل مندی دور کر رہی تھیں۔ خالہ بی بی کے چہرے پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ اُبھر آئی اور انہوں نے کہا:

"خیریت تو ہے میاں، سویرے سویرے چلے آئے ہو۔ کیا رات بھر نیند نہیں آئی؟"

واجد نے جھینپتے ہوئے کہا:

"خیریت ہے خالہ بی بی، آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے اس لیے چلا آیا ہوں۔" خالہ بی بی اور واجد دونوں ہنسنے لگے۔

واجد نے کہا:

"دراصل بات یہ ہے خالہ بی بی کہ اب کوٹھی بھائیں بھائیں کرتی ہے اور دل تنہائی سے اکتا گیا ہے۔ آپ کوئی رشتہ تلاش کریں۔"

وہ بولیں— "ہیں کیوں؟ اب تمہاری عمر بھی پختہ ہو گئی ہے۔ اب تو

بہت مشکل ہے میاں ۔ دوبار لڑکی ملی، دوبار دھوکہ ہو چکا، یہ بات سارے شہر کو معلوم ہے، وہاں کوئی بھی قدم رکھے گا تو پھونک پھونک کر رکھے گا۔ میاں ایک بات کہوں ! یہ جو پڑوسن کی زہرہ ہے ۔ بڑی سگھڑ لڑکی ہے۔ اس کی والدہ نے بھی اسے اٹھانے کا کہا ہے ۔ اگر تم کہو تو میں بات کروں۔ لیکن ایک بات ہے میاں ۔ اس کے ساتھ لڑکا بھی ہے ۔"

واحد تو اسی بات کا منتظر تھا ۔ اس نے کہا :

"لیکن لڑکے کے وارث تو لڑکے کو لے جائیں گے ۔ پھر ؟"

" میاں ! اس بچے کی وارث صرف اس کی والدہ ہے اور کوئی نہیں ہے، اور پھر اس بچے کو سرکار ہر ماہ ڈھیر ساری رقم بھی تو دے رہی ہے !"

" رقم کی ضرورت نہیں ہے خالہ بی بی مگر ....."

وہ خاموش ہو گیا ۔ خالہ بی بی بولیں :

" بیٹا تم اچھی طرح سوچ لو اور ایک نگاہ زہرہ کو کل دیکھ لو ۔"

اسے کل کا انتظار تھا ۔ وہ اپنے کمرے میں ایزی چیئر پر بیٹھا تھا ۔ اس نے دیواروں پر نظریں ڈالیں تو محسوس ہوا کہ وہ ساری تصویریں جو کہ اس نے نوچ کر پھینک دی تھیں پھر سے اُسے بلا رہی ہیں اور اپنی اپنی جگہ پانے کے لیے بے چین ہیں ۔

دوسرے دن وہ خالہ بی بی کے گھر گیا تو وہاں زہرہ اور اس کا لڑکا بھی تھا ۔ وہ سارے گھر میں دوڑتا پھر رہا تھا ۔

اس نے پہلی بار بچے کو بلایا تو وہ مسکرا کر بھاگ گیا ۔ دوبارہ آیا ۔ واحد نے بلایا تو وہ رکتا رکتا آ کر اس کے قریب کھڑا ہو گیا ۔

واحد کو یہ بچہ بہت پیارا لگا ۔ اس نے اُسے گود میں اُٹھا لیا ــــــ بچہ بھی مسکرانے لگا ۔

زہرہ بھی اس کے سامنے سے دو ایک بار گزری ۔ شائد واحد کو اچھی طرح دیکھنا چاہتی تھی ۔ واحد کی تو ہر طرح ہاں تھی بس ادھر کی ہاں کا انتظار تھا ۔

کھانے کے بعد زہرہ اور اُس کا بچہ چلے گئے تو واحد نے کہا :

" خالہ بی بی! مجھے زہرہ کی ہر شرط منظور ہے ۔"

رات گئے جب وہ اپنے کمرے میں مسرور مسرور سا لوٹا تو کمرے میں روشنی کرتے ہی اسے محسوس ہُوا کہ وہ تمام بچے جن کی تصویریں اس نے نوچ پھینکی تھیں ہمک ہمک کر اس کی گود میں آنا چاہتے ہیں ۔ واحد کے اندر جو اضطراب تھا اس کی جگہ اطمینان لے رہا تھا ۔ اسے پہلی بار زندگی میں سکون محسوس ہُوا ۔ رات بھر وہ خواب میں زہرہ اور بچے کے ساتھ مختلف کھیل کھیلتا رہا ۔ سویرے اٹھا تو سیدھا بازار گیا اور بچوں کی خوبصورت تصویریں خریدیں اور پھر سے انہیں دیواروں پر سجانے لگا ۔

●●

١٦ ایک شہر کی کہانی

" دیکھو مَیں سچ کہہ رہا ہوں ۔"

" بھئی تمہارا سچ یقین کی حدوں کے پار ہوتا ہے ۔"

" کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے لیکن وہ سچ ہی ہوتا ہے ۔"

" ہم کیسے یقین کر لیں ؟"

" لیکن مَیں جس شہر سے آیا ہوں وہاں ایسا ہی ہوتا ہے ۔"

میرے نئے آنے والے ساتھی نے اس سے پوچھا :

" کیسا ہوتا ہے ؟"

" اُجالوں کو اندھیرے چاٹ لیتے ہیں اور ہر جگہ اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا ہوتا ہے ۔"

" بھئی ! جدید باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں ۔ اِس کو سمجھا ۔" اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا ۔

مَیں نے کہانی سنانے والے کی طرف دیکھا ۔ اُس کا چہرہ گمبھیر بنا ہُوا تھا ۔ ہمارے یقین نہ کرنے کی جھلاہٹ بھی اُس کے چہرے پر تھی ۔

مَیں نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا :

" تم نے خود دیکھا ہے کہ دوسروں کی سُنی سُنائی اُڑا رہے ہو ؟ بھئی ایسا

ہوتا ہے ہوشیار لوگ محفل میں برتری جتانے کے لیے کہانی گڑھ بھی لیتے ہیں۔"

اس نے معصومیت سے کہا:

"مجھے شہر کی فکر ہے نہ مٹی کا خدشہ۔ اور نہ ہی میں محفل میں برتری چاہتا ہوں، پھر بھی میں کہوں گا کہ میری بات سچ ہے۔"

میرے ایک تیسرے ساتھی نے کہ جس کو اندھیروں اور روشنیوں سے بڑی دلچسپی ہے کہا:

"بھئی میں وہ منظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ چاند گہن اور سورج گہن لگتا تھا تو میری دادی کہتی تھی کہ قرض خواہ آکر ان کو نگل جاتا ہے اس لیے ایسا ہوتا ہے۔ چلو دیکھیں ہماری بستی قرض داروں سے بھری تو نہیں پڑی ہے۔"

میں نے بھی اس کی تائید کی۔

ہمارا قافلہ سوئے منزل گامزن ہوا۔

منزل پہ پہنچے تو ہماری گھڑیوں کے مطابق صبح ہونی چاہیے تھی۔ اُجالا پھیلنا چاہیے تھا۔ لیکن صبح ہو رہی تھی نہ اُجالا پھیل رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھے ہیولے سے آ جا رہے تھے۔ میں نے ایک ہیولے کو روک کر پوچھا:

"یہاں صبح کب ہوگی؟"

وہ ہنسا۔ اور ہنستا ہوا چلا گیا۔

میں نے ایک دوسرے ہیولے کو روک کر پوچھا تو اس نے کہا:

"اجنبی معلوم ہوتے ہو۔"

"ہاں!"

اُس معقول شخص نے شہر کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے کہا:

"یہ نشاط کا شہر ہے۔ یہاں بے حسی چھائی ہوئی ہے۔ اور جب کبھی شہر پہ

بے حسی چھائی ہوئی ہوتی ہے تو وہاں کے اُجالوں کو اندھیرے چاٹ لیتے ہیں۔

"یہ شہر اتنا بے حس ہے کہ خود کو اندھیروں میں چھپ جانے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔"

مَیں نے کہانی سنانے والے سے کہا:

"تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تم نشاط کے شہر سے آئے ہو۔ ہم تمہاری کہانی سننے کے بعد یقین کی حدوں کے پار اُتر جاتے۔"

ہم پانچوں واپس اپنی منزل کی جانب روانہ ہوئے۔ تھوڑی دُور پہ اُجالا ہمارا منتظر تھا۔

••

۱۷ اپنی مٹی

رات اندھیرے کی چادر میں لپٹی ہوئی خاموش ہوتی تھی۔ دن بنجر زمین کی طرح سنسان ہوتا تھا۔ کہیں کوئی آواز سنائی دیتی تھی تو وہ دھائیں کی آواز تھی جو اندھیرے میں تھرتھراہٹ پیدا کرتی تھی اور پھر دھائیں کی آواز کا پیچھا کرتی۔ چیخ جو بھیانک ہوتی تھی، پھر جیسے وہ چیخ آسمان کی طرف پرواز کرتے ہوئے معدوم ہوتی جاتی تھی۔ کہیں کہیں آگ کی لپٹیں آسمان تک پہنچی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اندھیرے کو دھوئیں نے پھیل کر دبیز کر دیا تھا۔ اندھیرا جیسے دیوار کی طرح جم گیا تھا۔

ماں اپنی تیز نظروں سے اندھیرے کی دیوار چیرتی پھاڑتی دُور تک دیکھ لیتی تھی، کوئی ہیولا سا نظر آتا تھا۔ لیکن غور سے دیکھنے کے بعد یہ اندھیرے کا فریب معلوم ہوتا تھا۔ ماں کے ذہن میں ابّا کا جو ہیولا تھا وہی آتا ہُوا محسوس ہوتا تھا۔ چند ہی لمحوں میں ماں کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ فکر و پریشانی میں کھو جاتی، اور وہ ماضی کے جھروکوں سے جھانکنے لگتی۔

جب غم و آلام دہلیز سے باہر ہوتے ہیں۔ صبح و شام دوپہر سب ہی حسین ہوتے ہیں۔ ہمارے گھر کا بھی یہی حال تھا۔ گھرانہ خوش حال تھا۔ ابّا صبح کی نماز پڑھ کر آتے۔ ہم سب جاگ جاتے، پھر کسی کو کالج جانے کی سوجھتی، تو کوئی گیند بلّا لے کر گھر کے قریب والے میدان کا رُخ کرتا۔ روز کی طرح آج کی صبح بھی وہ تمام خوشیاں لے کر آئی جو روز لے کر آتی تھی۔ ابّا حسب معمول آئے۔ سب اپنے اپنے کاموں میں جُٹ گئے۔ کسی کو کسی کی فکر نہیں۔

ابّا اپنے آفس چلے گئے۔ ماں گھر کے کاموں میں اُلجھ گئی۔ صبح دوپہر کی طرف رواں ہو گئی۔ شہر میں بارات سی رونق ہو گئی۔ اچانک سارا منظر یک لخت بدل گیا۔ سارے شہر کو دھوئیں نے ڈھک لیا۔ فضا میں بارود کی اور خون کی بو، خنجروں اور تلواروں کی آواز سنائی دینے لگی۔ اندھیرے میں اپنے آپ کو بچاتے راہ ٹٹولتے ہم سب بھائی گھر تک پہنچ گئے۔ لیکن ابّا نہیں پہنچ سکے۔ فون بند، بجلی بند، سڑکیں بند، باہر کے دروازے بند تھے۔ اگر دشمنوں کے بس میں ہوتا تو ہماری طرف آنے والی ہوا بھی بند کر دیتے۔ لیکن یہ ان کے بس میں نہ تھا۔ اس لیے ہماری سانسیں جاری تھیں۔ ان آتی جاتی سانسوں کے بیچ بس ابّا کا انتظار تھا۔

جب کبھی ابّا موڈ میں ہوتے تو پرانے قصے سنانے بیٹھ جاتے تھے۔ ہمارے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھ کر کہتے :

" جب میں تمہاری عمر کا تھا بالکل بنگر لوائے۔ اس وقت مجھے آزادی کا مفہوم بھی نہیں معلوم تھا، لیکن میں نے آزادی کی لڑائی میں حصّہ لینا شروع کر دیا تھا۔ بس ہم وہ کرتے تھے جو بڑے لوگ بتاتے تھے۔ جلوس نکالنا، لے کے رہیں گے آزادی، دے کے رہیں گے جان، انقلاب زندہ باد! اسی طرح کے نعرے لگاتے سڑکوں، گلیوں میں بھٹکتے، کبھی کبھی پولیس ہم پر ڈنڈے برساتی تو ہم پھولوں کی طرح انہیں جھیلتے، کیوں کہ آزادی کا سودا سر میں سما گیا تھا۔

جیسے جیسے آزادی کی منزل قریب آتی جاتی تھی، ہم کو محسوس ہو رہا تھا کہ ہماری منزل دُور ہوتی جا رہی ہے۔ ایسے وقت میں کچھ بڑے بوڑھوں نے ایک قوم، ایک ملک، ایک زبان اور ایک مذہب کا نعرہ لگایا۔ مجھے وہ اچھا لگا۔ اس لیے میں اُس نعرے کے ساتھ ہو گیا۔"

بیچ بیچ میں ماں کہہ اُٹھتی :

" انہیں نعروں کے چکر میں تم نے سب کچھ کھو دیا۔ گاؤں کی زمین داری، بڑے باڑے کے ساتھ حویلی بھی۔ کیا اچھی ہوا تھی ہمارے گاؤں کی، اور وہ پچھواڑے کی بیری کے بیر کتنے میٹھے ہوتے تھے۔ یہاں اُجاڑ ایک پتّہ بھی دیکھنے کو نہ ملے۔ ناطے بندھن سب چھوٹ

گئے۔ رشتے سب ٹوٹ گئے۔"

ابا خشمگیں نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھتے اور کہتے :

" لیاقت کی ماں تم نہیں جانتیں، کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ ہم نے پاک مٹی پالی۔ اس کے بدلے جو کچھ کھویا وہ کم ہے۔"

ابا پھر شروع ہو جاتے :

" پھر کیا ہوا۔ گھر والوں نے مجھے سُدھارنے کے مقصد سے شادی طے کر دی لیکن میں نے تمہاری اماں کو سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ چلنے پر راضی کر لیا میں سوچتا تھا بس ہم کو پاک مٹی میں گڑنا ہے۔ ہمارے اپنے وطن میں۔ تب میں یہاں آگیا۔

یہاں آنے کے بعد معلوم ہُوا کہ میرے سارے خاندان کو اُدھر دشمنوں نے ختم کر دیا ہے۔ ہم نے بھی اپنے خاندان کا بدلہ اِدھر لے لیا... بہت سارے دشمنوں کو ختم کر دیا، اگر میں سیانوں کے بہکاوے میں آجاتا تو میری ہڈیاں کسی ناپاک جگہ پڑی ہوتیں اور گوشت گِدھ نوچ چکے ہوتے...... اور پھر لیاقت کی ماں تم سوچو، یہاں سب کچھ اپنا ہی ہے۔"

ہم ابا کو زیرِ اضطراب نگاہوں سے دیکھتے۔ کیوں کہ ہم محسوس کرتے تھے کہ کچھ لوگ ہم پر ہر وقت نفرت کی نگاہیں گاڑتے ہیں، اور ہر جگہ نبرد آزما ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے پاس علم و عقل اُن کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ اِس لیے ہم اُن سے آگے نکل جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے دِلوں میں نفرت نے جگہ لے لی ہے۔ لیکن ابا ایسے خوش ہیں کہ جیسے اُنھیں دنیا ہی میں جنت مل گئی ہے۔

ماں کبھی کبھی اپنے رشتہ داروں کو یاد کر کے رو پڑتی تھی، کیوں کہ اسے کسی ملک یا قوم سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ تو ابا کے ساتھ گائے کی طرح بندھی تھی۔ ہماری طرح۔ ماں کے اندر بھی اضطراب تھا۔ وہ مقامی عورتوں کی کڑی نفرت جھیلتی تھی۔ آج یہی نفرت اُبل پڑی تھی، بندوق کی گولیوں کی صورت میں، خنجر کی کاٹ کے رُوپ میں، تلوار کی دھار کی مانند!

ماں اندھیرے کو کاٹتی دُور تک نظریں گاڑتی۔ لیکن بے سُود۔ پھر اس کا ذہن اُڑتا ہُوا اس کے گاؤں پہنچ گیا۔ جہاں وہ تھی، ہمجولیاں تھیں، خوشیاں تھیں، کھلیانوں میں بالیاں تھیں، باغوں میں تتلیاں تھیں، بہاریں تھیں، خوش گوار ہوائیں تھیں، بے فکری تھی۔ ندیوں میں پانی چم چم چمکتا تھا۔ کھیتوں میں فصلیں لہلہاتی تھیں۔ آسمان سے خوشیاں برستی تھیں، پھر یوں بے چینی کی لہر اٹھی جیسے ہواؤں پر دہ ہِل رہا ہو۔ اس بے چینی نے نفرت کی جگہ لے لی۔ اپنی مٹی سے نفرت، اپنے لوگوں سے نفرت۔ پھر جیسے ہر دیوار، ہر گھر، ہر گلی افواہوں کا مرکز بن گئی۔ عجیب باتیں، انوکھے قصّے، مار دھاڑ کاٹ کی اور لوٹ مار کی باتیں، دہشت کا سیلاب اُمنڈ پڑا۔ اور ایک دن گاؤں کی مسجد میں مولانا نورالحق نے اعلان کیا کہ وہ کل سرزمینِ پاک کی طرف جا رہے ہیں۔ جو چلنا چاہے ہمارے ساتھ چلے۔ اور دوسرے دن نمازِ فجر کے بعد ایک بڑا قافلہ آہ و بکا کے ساتھ معلوم منزل کی جانب نامعلوم راستوں سے چلا گیا۔

اُس وقت سارا گاؤں مولانا سے گلے مِل کر رو رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ کون سی نفرت تھی جس کا ذکر لوگ کیا کرتے تھے، یہاں تو کیا ہندو کیا مسلمان سب ہی رو رہے تھے۔ اِس لیے کہ ان کے چند لوگ اُن سے جُدا ہو رہے تھے۔ ہر آنکھ سے محبت کے آنسو بہہ رہے تھے۔

دوسرے دن اس کی شادی طے بھی ہوئی اور شام ہوتے تک ہو بھی گئی۔ تیسرے دن وہ مہندی لگے ہاتھوں، گوٹے کناری کے لباس میں لدی پھندی لیاقت کے ابّا کے ساتھ آہ و بکا کے طوفان میں اس منزل کی طرف بڑھ گئی، جس کا خاتمہ یہاں ہُوا تھا۔ وہ ماضی سے پھر حال میں آ گئی۔

آج کیا ہوا؟ وہ کیوں نہیں آئے؟ اس نے پھر اندھیرے کی دبیز چادر کو اپنی نگاہوں سے چیرنے کی ناکام کوشش کی۔ زندگی میں یہ پہلا اتفاق تھا۔ اِس لیے ماں کے ساتھ ساتھ ہم سب بے چین تھے۔ ماں اندھیرے کی دبیز چادر کو اپنی آنکھوں سے کاٹتے پھاڑتے تھک جاتی تو باری باری ہم سب کو چھو کر محسوس کرتی۔ کبھی کبھی وہ یا اللہ کہہ کر اپنی مجبور آہ اللہ تک پہنچانے کی کوشش کرتی۔

رات نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سفر تمام کیا۔ صبح پیلی پیلی دھوپ نکلی تو ماں کھڑکی کے پاس جاکر کھڑی ہو گئی۔ وہ حدِ نگاہ تک سڑکوں کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اسی وقت بڑے بھائی محمد علی نے اور منجھلے بھائی ذوالفقار علی نے ماں کو وہاں سے کھینچ کر کمرے کے وسط میں کر دیا۔ اسی لمحہ پتہ نہیں کس سمت سے ایک گولی کھڑکی پر لگی اور کھڑکی کے شیشے احتجاج کرتے ہوئے نیچے گر کر یوں چکنا چور ہو گئے جیسے ہمارا یقین بکھر رہا تھا کہ یہ زمینِ پاک ہماری اپنی نہیں ہے۔

شہر کے در و دیوار غم کے کوہ بنے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ کبھی کبھی بھاری بوٹوں کی، یا دندناتی جیپوں کی آوازیں آتیں یا پھر چیخیں سنائی دیتیں۔ سارا دن یوں ہی ابا کی راہ تکتے گزر گیا۔ پھر وہی کرب ناک اندھیرے کی دبیز چادر۔ اور کہیں کہیں اس چادر میں سوراخ ڈالتا اجالا جو جلتے گھروں سے پیدا ہو رہا تھا۔ فضا دھواں آلود ہو چکی تھی۔۔۔ پورا ماحول غمگین ہو چکا تھا۔ ہم سب جیسے غنودگی کے عالم میں تھے، زندہ نہ مُردہ، بیچ کی کوئی کیفیت تھی۔

ماں سوچتے سوچتے تھوڑی دیر کے لیے یوں غافل ہو جاتی جیسے اپنے سہاگ کو چھیننے کے لیے مالکِ حقیقی کے پاس پہنچ گئی ہو۔ جب وہ آنکھیں کھولتی تو ہم تینوں بھائیوں کو چھو کر اطمینان کر لیتی کہ ابھی تک اس کے پاس ہی ہیں۔ پھر بڑی یاس و حسرت بھری نگاہوں سے یوں دیکھتی جیسے اُسے یقین نہ ہو کہ ہم یوں ہی اس کے ساتھ ہمیشہ رہیں گے۔

پتہ نہیں یوں ہی کتنے دن بیتے۔ مگر ہمارے لیے وہ صدیوں سے کم نہ تھے۔ ماں کی نقاہت اور بڑھاپے میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے ہم لوگوں سے زیادہ کرب جھیلا تھا۔ اب ماں کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور لبوں پر دوار سے پر جم گئی تھیں۔ صبح شام، دن رات کا فرق مٹ گیا تھا۔ ہر گھر ایک قید خانہ بن گیا تھا۔۔۔۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آوازیں بھی قید کر لی گئی ہوں۔

ایک دن صبح آوازیں آنے لگیں تو محسوس ہوا کہ آہنی زنجیر دلں کی کڑیاں ٹوٹ،

گئی ہیں۔ لوگ باگ باہر نکل آئے ہیں۔ سڑکوں پر سمٹے سمٹے ڈرتے ڈرتے اپنی ضرورت کی چیزوں کی تلاش میں جلدی جلدی قدم اٹھاتے نظر آتے لوگ۔ بڑے بھائی ابا کی تلاش میں باہر جانا چاہتے تھے۔ لیکن ماں انہیں روک رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ہم لوگوں میں سے کوئی باہر گیا تو پھر واپس بھی آئے گا یا نہیں۔ ہم لوگوں میں سے ہر کوئی باہر جانا چاہتا تھا۔ ماں چاہتی تھی کہ وہ بھی ہمارے ساتھ چلے۔ منجھلے بھائی نے فیصلہ سنایا کہ ماں بھی ساتھ چلے لیکن دوبارہ بھگدڑ مچ گئی۔ دوبارہ بھائی چارگی کی جگہ نفرت نے لے لی اور جن سے نفرت ہے ان کا خون بہانا اولین مقصد بن گیا۔ ایسے ماحول میں ماں کا ساتھ چلنا مناسب نہیں تھا۔ ماں نے ہم تینوں کو گلے لگا لیا۔ اس کی سوکھی آنکھوں میں پتہ نہیں کہاں سے آنسو آنے لگے۔

ہم لوگوں نے تین چار دنوں کی کوشش میں شہر کا کونا کونا چھان مارا، لیکن نتیجہ یہی نکلا کہ ابا ہم لوگوں کو روتا بلسورتا چھوڑ کر اُن کی پاک جنت میں کہیں گم ہو گئے ہیں۔ اُن کے آفس سے اتنا معلوم ہو سکا کہ ہنگاموں سے چند منٹ پہلے وہ آفس چھوڑ چکے تھے۔ اب ہم لوگوں نے ان کی واپسی کی آس چھوڑ دی تھی۔

ایک دن ہم تینوں بھائی تھکے ماندے گھر واپس آئے تو ماں کو مال و اسباب باندھتے دیکھا۔ ہم تینوں نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ بڑے بھائی نے ماں سے پوچھا:

"کہاں کی تیاری ہے؟"

ماں ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولی:

"چلو بیٹے اپنی مٹی کی طرف چلتے ہیں۔ جو مٹی اپنے لیے کھاد مہیا کرنے والوں کے خون سے سینچی جاتی ہو وہ ہرگز پاک نہیں ہو سکتی۔"

اتنا کہہ کر ماں پھر سے اسباب باندھنے لگی۔

ہم تینوں بھائی لامتناہی خلاء میں دیکھنے لگے۔

●●

APNI MITTI

Short Stories By

AHMED USMANI

مصنف کی دوسری کتابیں

اپنے آپ کا قیدی

رات کا منظر

سرورق کتابت طباعت احمد حنیف تواگی مالیگاوں